

گلے و گیس خواتین کا مقبول ترین ناول

میں تیرا خالی کمرہ ہوں

فائزہ افتخار



میں ایک خالی کمرہ ہوں۔

میری دیواریں خالی نہیں ہیں۔ ان میں جا بجا ایک مسکراتے حسین چہرے کی تصویریں آویزاں ہیں۔ اس کے باوجود میں خالی کمرہ ہوں۔

لائٹ پنک کلر کی بیڈ شیٹ وائٹ پینٹ والے اسٹنل بیڈ پر اب بھی بے شکن اور بے داغ پچھی ہے۔ اسی رنگ کے بھاری پردے اب بھی ہمیشہ کی طرح سارا دن بندھے رہتے ہیں اور ڈارک گلاس ونڈو پر مہین سفید جالی کا پردہ ابھی تک لٹکا ہوا ہے۔

کسی شام ان ہاتھوں نے حسب معمول شام کے سائے گہرے ہوتے ہی لائٹیں آن کرنے کے بعد اسے گرایا ہے اور پھر وہ صبح نہ آئی جب وہ ہاتھ حسب عادت اور حسب معمول بھاری پنک بندھے ہوئے پردوں کے ساتھ ساتھ جالی کے اس باریک سفید پردے کو بھی ہٹاتے تاکہ سارا دن تازہ ہوا اور روشنی کمرے میں بنا کسی رکاوٹ کے آتی

رہتی۔

وائٹ ڈیرنگ نیبل پر گرد کی ہلکی سی تہ ضرور جمی ہے مگر وہ سب چیزیں جوں کی

تو اسی ترتیب سے رکھی ہیں جس ترتیب سے ان ہاتھوں نے انہیں آخری بار رکھا تھا۔ وہ جھمکنیں ٹیلکم پاؤڈر۔ وہ ڈیوڈنٹ اسپرے بلیک آئی پنل، میز برش، وہ اسٹریپری کی خوشبو والا پگلوڈ نیچرل کلاب اسٹک اور وہی نل پالش کے تین مخصوص شیڈز جو اسے بے حد پسند تھے۔ سامنے آویزاں آئینے کے راؤنڈ ہیپ فریم پر وہی کلپ لگے تھے اور ڈریسنگ کے ساتھ وائنٹ پینٹ والا آئرن راڈ کا خوب صورت اسٹینڈ رکھا تھا جو اس گھر میں آیا تو باہر برآمدے میں رکھنے کے لیے تھا اور گلاسٹا جانے کے کام آتا تھا مگر اس کی ضد پر اس کمرے میں رکھ دیا گیا اور پھر اس میں گیلے کے بجائے یہ باسکٹ رکھ دی گئی جو اس کی رنگ برنگ ربر بنڈ اور جسی اسٹائل کی جیوہری سے بھری تھی۔ سامنے کی دیوار پر لگے کی ماؤس کی ہیپ والے میوزیکل وال کلاک پر ساڑھے سات بجے کا وقت تھا۔ پتہ نہیں یہ ساڑھے سات صبح کے تھے یا شام کے کلاک کیونکہ کئی روز سے یہیں رکی ہوئی تھی۔ کلاک کے سیل ایکسپائر ہو چکے تھے۔

رائٹنگ ٹیبل پر رکھا لیپ بھی وہی تھا۔ وہی اس کا پرانا دوست مہراؤ وہی خوب صورت شیڈز والا لیپ جو اسے تیرہویں برتھ ڈے پر گنٹ ملا تھا اور جس کو رات کی تنہائیوں میں روشن کر کے خود کلامیاں کرنے کی وہ تب سے ہی عادی ہو گئی تھی۔ بہت دن ہوئے کسی نے اس لیپ کو ان کر کے اس کی مڈم گلابی روشنی پر نظر نہیں مڑا کے سر گوشیاں نہیں کی تھیں۔ یہ لیپ بھی وہیں موجود تھا مگر کتنا ادا اس۔ اس رائٹنگ ٹیبل کی درازوں میں اس کی کتابیں اور ڈائریاں بھی اب تک موجود ہوں گی۔ وہ سارے گریٹنگ کارڈز بھی جن کو سنبھالے رکھنے کی وہ عادی تھی۔ اس کاپی۔ سی بھی اسی ٹیبل پر اب تک رکھا تھا۔ کافی عرصہ ہوا اسے بھی کسی نے چھوا تک نہ تھا۔

رائٹنگ ٹیبل جس دیوار کے ساتھ رکھی تھی اس دیوار کو مختلف تصویروں نے بھر رکھا

تھا۔ ان تصویروں کی صورت میں ایک زمانہ اس دیوار پر سانس لے رہا تھا۔ زندگی کے کئی گزرے سال ثبت تھے اس دیوار پر۔ کتنے حسین پل اور یادگار لمبے قید تھے۔

سب کچھ تھا۔ وہ سب کچھ جو اس کے ہوتے ہوئے تھا۔ بس ایک وہ نہ تھی۔ جس کے ہونے سے یہ سب کچھ واقعی سب کچھ لگتا تھا۔ اب وہ نہیں ہے تو یہ سب کچھ ”کچھ بھی نہیں“ ہے۔ ہر چیز کو نہ کرتی محسوس ہوتی ہے۔ میرا یعنی اس کمرے کا خانا پن اپنے خالی ہونے کا حساب مانگتا ہے۔ میں جانا چاہتا ہوں کہ اب میرا مصرف کچھ ہے؟ میرے اندر وہ قہقہے پھر نہیں نکھر سکتے پھر یہ دیوار کیس لیے؟ اس گلابی نرم نیلے پردہ چلنے بھورے سنہرے بالوں کے گچھے اب کبھی نہیں پھیلیں گے پھر یہ اس بستر کیوں پڑا ہے؟

اس آئینے پر اب کبھی وہ عکس داد طلب انداز میں نہیں لہرائے گا پھر اب تک اس دیوار پر کیوں آویزاں ہے؟ کیوں نہیں چٹنا چور ہو جاتا گر کر؟ اس کی بورڈ کو اب وخر و طیسی اٹھائیں کبھی نہیں چھیزیں گی پھر یہ کس لیے ٹیبل پر رکھا ہے؟ کیوں رکھا ہے مجھے جوں کا توں؟ جب کوئی اسے نہیں رکھ پایا تو مجھے کیوں؟

آج میں یہاں اس سب سوالوں کے جواب مانگنے کے لیے عدالت لگاؤں گا۔ سب کو طلب کروں گا۔ مدعی..... استغاثہ..... ملزم..... سب کو۔ اس خالی کمرے میں کوئی آواز تو پیدا ہو۔

نازنین محمود حاضری ہو!



”اب تمہاری عمر ہے یہ چیزیں دیکھنے کی۔ بچی نہیں رہیں تم۔“

”اتنی بڑی بھی نہیں ہوئی کہ اتنی کے ساتھ بیٹھ کے قابل اور ہر فن مولا قسم کی بہو

بننے کی ٹریننگ دینے والے ایڈیٹ ڈرامے دیکھوں۔“

اُف وہ اس کی قہقہی کی طرح چلتی زبان وہ اس کا ترکی بہ ترکی جواب دیتا جو مجھے غصہ دلا دیتا مگر وہ اس کی من موٹی سی صورت وہ بچوں کی سی مصومیت والی کھلی کھلی مسکراہٹ وہ حیران بڑی بڑی سہری آنکھیں اور وہ اس کا لاڈ سے میرے گلے میں بانٹیں ڈال کے لہجے میں بے پناہ پیار سو کے مجھے ”پیا“ کہہ کے پکارتا۔ یہ سب میرا غصہ سینکڑوں میں بھگانے کے لیے کافی تھے۔ میں اس سے چند منٹ سے زیادہ ناراض رہ ہی نہیں سکتی تھی اور وہ..... وہ تو شاید ایک منٹ بھی نہیں۔

میں نے چابی گھمائی اور پینڈل پر ہاتھ رکھ کے دروازہ آہستہ سے پرے دھکیلا۔ اس کمرے کی چابی میرے پاس ہی تھی۔ وہی تھی۔ ان گزرے چند مہینوں میں میں کتنی ہی بار اس کمرے میں آئی تھی مگر یوں نہیں جیسے آج۔ زیادہ تر تو میں شنو سے یہاں کی صفائی کروانے آتی تھی ہفتہ دن بعد۔

میٹو بار بی پینک کلر بہت پسند تھا۔ اس کمرے میں زیادہ تر یہی رنگ نظر آتا تھا۔ اسی رنگ میں بیشتر بیڈ کور تھے اور اسی رنگ میں کٹن کورنگر میں بار بار یہی ایک بیڈ کور دھلا دھلا کے بچھا دیتی ہوں جو آخری بار اس نے اپنے ہاتھوں سے بچھایا تھا۔ ایک ایک چیز بھڑائی پوچھتی ہوں مگر پھر احتیاط سے وہیں رکھ دیتی ہوں جہاں سے میں نے انہیں اٹھایا ہوتا ہے۔ اکثر میرے ساتھ شنو ہوتی ہے یا پھر آٹلی۔ اس لیے میں جس کام سے آتی ہوں اسی کام کی جانب اپنا سارا دھیان لگانے میں کسی حد تک کامیاب بھی رہتی ہوں۔ ورنہ اس کمرے کی ایک ایک چیز اس کی فضا اس کی مخصوص مہک

کتنے دن بعد آج میرا دل بے اختیار اس دروازے کی جانب کھینچ رہا ہے۔ میں وہاں جانا چاہتی ہوں۔ کس لیے؟ یہ تو میں نہیں جانتی مگر میں خود کو روک نہیں پا رہی ہوں اور میں خود کو روکنے کی کوشش کس لیے کر رہی ہوں یہ بھی میں نہیں جانتی۔

یہ وہی دروازہ ہے۔ اسی کمرے کا دروازہ..... جس دروازے کے اس پار سے کبھی اس کے قہقہوں کی آوازیں آتیں۔ کبھی کارٹون نینٹ دہک پر گنگے پاریف گرلز کارٹونز کی آوازیں ابھر رہی ہوتیں اور میں نزدیک سے گزرتے ہوئے لازماً ذرا سا اسے کھول کے سراندر گھسیڑ کے اسے تاکید کرتا نہ بھولتی۔

”میں تو اہم کم کرو۔ بھلا کارٹونز بھی کوئی اتنی اونچی آواز میں دیکھتا ہے۔ تمہیں پتا بھی ہے کہ ایک تو کسی بچے کی کنٹری اور دوسرا یہ دھم دھم دھوں والے کارٹونز کی آوازیں میرے سر میں درد پیدا کر دیتی ہیں۔“

”کم آن پیا“ کارٹونز بھی بھلا کوئی ہلکی آواز میں دیکھتا ہے۔“ وہ میرے انداز میں میری ہی بات مجھے بھولاتی۔ مجھے غصہ آ جاتا۔

سب مجھے بے چین کر دیتے ہیں۔ ابھی چار یا پانچ دن پہلے تو میں شنو کے ساتھ آئی تھی ساری تفصیلی صفائی کی تھی۔ کارپٹ پر دیکھو بھی کیا تھا! تقریباً پون گھنٹہ تک اس کمرے میں رہی اور بلا وجہی شنو سے اسے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی اور وہ بے چاری حیران پریشان کی کہانیاں سن رہی تھی۔ لے دینے رہنے والی۔ اس کی بے نیکی باتوں کے جواب میں ہوں ہاں سے کام چلانے والی اور کبھی چڑھنے والی تو نیکی لڑکی کو نوک کر خاموش کر دینے والی اب خود بے لنگان بول رہی تھی۔

دراصل میں اس کمرے سے بچنا چاہتی تھی۔ جیسے ایسا لگ رہا تھا جیسے چاروں جانب سے دیواریں مجھ پر تنک ہو رہی ہوں۔ پتہ تو اپنے اور فرش اوپر کی طرف جا رہا ہو۔ جیسے کچھ ہی دیر میں میں اس سب کے درمیان پس کے رہ جاؤں گی اور آج..... آج جب میرے قدم بے اختیار ہو کر خود مجھے اس جانب کھینچ لائے ہیں تو اس کمرے کی بائیں کشادگی کے ساتھ پھیلی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ہر چیز اسی وارفتگی سے مجھے تکی سمجھیں ہو رہی ہے جو وارفتگی اور دلہانہ پن میں نوک کا خاصہ تھا۔

”پیا!“ ایک چپکاری سنائی دی۔

میں نے چونک کے بیڈ کے اوپر لگی اس کی بڑی کی تصویر کی جانب دیکھا۔

یہ تصویر تب کی تھی جب وہ سات برس کی تھی۔ ان دنوں ماما پایا دونوں حیات تھے۔ یہ شاید ان کے آخری دنوں کے زمانے والی تصویر تھی ان دنوں میتو خاصی صحت مند ہوتی تھی۔ میں نے غور سے تصویر کو دیکھا چاہا اور اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ یہ تصویر پایا نے اسے بتائے بغیر اچانک کھینچی تھی۔ اس کے لیے اس کے تاثرات بہت نچرل اور بے ساختہ تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ شام پایا نے مجھے اشارہ کیا تھا اور میں دبے پاؤں چلتی

پاپا کے ذرا آگے کھڑی ہو گئی تھی۔ میتو کی پشت ہماری جانب تھی۔ وہ برآمدے میں رکھے لوہڑے کے بڑے سے رنگین پیئرے کے پاس کھڑی تھی۔ ابھی ابھی نہا کے نگلی تھی اور اس کے ریشم کے سنہری گتھوں جیسے لمبے بال گیلے ہونے کے بعد بہت گھٹکریا لے لگا کرتے تھے۔ اس نے وہ ریڈ اور اداس فراک پہنی تھی جو تانواں کے لیے پچھلے سال بالینڈ سے لائے تھے اور جو اسے تب تو پھر بھی پوری تھی مگر اب بہت چھوٹی اور تنگ ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود وہ اب بھی اسے ضد کر کے پہنا کرتی کیونکہ اس کا ڈیزائن اسے پسند تھا اور یہ بھی کہ وہ تانواں کا تھا۔

”میتو!“ میں نے اسے آواز دی تھی اور چونکہ اسے کسی اور کی یہاں موجودگی کا علم نہ تھا اس لیے وہ چونک کے چلتی تھی۔ حیرانی ابھی اس کی آنکھوں سے صبح طرح سے رخصت نہ ہوئی تھی اور میرا چہرہ دیکھ کے اچانک اس کے لبوں پر جو مسکراہٹ آئی تھی اس ایک لمبے کو پایا نے کمرے کی نگاہ میں قید کر لیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی حیرت اور دبے دبے ڈر کے ساتھ ہونٹوں پر پھیلی بے ساختہ مسکراہٹ..... ان تاثرات کے استخراج نے اس تصویر کو ایک شاہکار بنا دیا تھا۔ پایا نے اس تصویر کو اعلان کر کے لاؤنچ میں لگایا تھا۔ جو بھی دیکھتا اس پر بغیر نہ ہٹا مگر ماما کو یہ بات پسند نہ آئی۔ ان کی وہی طبیعت کا خیال تھا کہ اس طرح ان کی بیٹی لوگوں کی نظروں میں آ رہی ہے۔ انہی دنوں وہ شدید بیماری ہوئی جس نے ماما کا یہ وہم اور تقویت پکڑ گیا۔ انہوں نے اس تصویر کو اتار کے ہمارے مشاعرے کے بیڈروم میں لگا دیا۔ بعد میں اکل آئی کے ہاں آنے پر اس تصویر کو میتو کے بیڈروم میں جگہ ملی اس کمرے میں۔

میں نے اس تصویر پر ہاتھ پھیرنا چاہا اور میری انگلیوں پر اس کی نرم و نازل جلد کا لمس تازہ ہو گیا۔ اس کے گھٹکریا لے بال جو گیلے گیلے سے تھے پر لٹک رہے تھے ان

کی نمی میری اٹھلیوں کو بھگو گئی۔ اس کے گدرائے ہوئے ننھے سے ہاتھ کی ایک انگلی اس کے منہ میں تھی، مسکراتے گاابی ہونٹوں کی اوٹ سے سفید دودھ سے دو دانتوں کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ میں اس تصویر پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے جیسے اس زمانے میں واپس لوٹ رہی تھی۔ میری آنکھوں نے اس کے عکس کو متحرک ہوتے دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ ایک دم کلک کلاہٹ میں بدلی۔

”پیا آپ..... ذرا دیا ناں مجھے۔“ اس کی میٹھی آواز سنائی دی پھر اس کا ریڈ ڈائس والا واٹس فراک ہوا سے پھڑ پھڑایا۔ وہ قلائیں بھرتی میری جانب آ رہی تھی۔ میں نے اپنے بازو اکیے اور اسے سینے سے لگا کے آنکھیں موند لیں۔ اب میں وہاں تھی۔ آج سے آٹھ سال پہلے کے زمانے میں۔



پاپا..... ماما..... میں نازنین محمود اور مینو..... زمین محمود۔ یہ تھے ہم چار اور یہ تھی ہماری چھوٹی سی دنیا۔ خوشیوں بھری جنت سی دنیا۔ جسے نہ جانے کس کی نظر کھا گئی۔ مینو مجھ سے پورے دس سال چھوٹی تھی۔ دس سال تک میں نے اپنا اکلوتے ہوئے کا اسٹش خوب انجوائے کیا تھا۔ ماما پاپا دونوں کی بھرپور توجہ اور لاڈ تنہا سیٹے تھے۔ ایسے میں دس سال بعد جب وہ گول مثل سی سنہرے بالوں والی گڑیا سب کی توجہ اپنی جانب کھینچنے آگئی تو فطری طور پر مجھے ڈسٹرب ہونا چاہیے تھا۔ اس سے جلیسی فیل ہونا چاہیے تھی مگر ایسا نہ ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں خاصی سمجھ دار ہو چکی تھی اور شاید اس لیے بھی کہ ذرا ہوش سنبھالتے ہی میں نے خود اس کی کوشدت سے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا مگر میرے خیال میں سب سے بڑی وجہ یہی ہوگی کہ مینو بھی ہی اتنی پیاری کہ کوئی اس کے خلاف دل میں برا خیال چاہے بھی تو نہیں لاسکتا تھا۔ وہ صرف پیار و صوفیہ لئے اس دنیا میں آئی تھی۔

ماما پاپا کی طرح میں نے بھی اللہ کی طرف سے عطا کردہ اس خوب صورت کھلونے کے خوب لاڈ اٹھائے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ آنے والے سالوں میں یہ فریضہ مجھے اکیلے ہی ادا کرنا پڑے گا۔ ماما پاپا اپنے حصے کی محبتیں اس پر نچا کر کرنے کے لیے بھی مجھے ہی منتخب کریں گے۔ ایک حادثے میں وہ دونوں چل بے اور مجھے یعنی ایک اٹھارہ سالہ لڑکی کو اس کی چھوٹی بہن کی ذمہ داری سونپ گئے اور میری ذمہ داری..... وہ انکل آئی نے بخوشی اٹھائی۔ انکل آئی یعنی میرے تایا اور تائی جن کو میری ذمہ داری بہت پہلے باضابطہ طور پر پایا خود سونپ چکے تھے یعنی ان کے منہ پہلے بیٹے صاعد سے میری نسبت طے کر چکے تھے۔

پاپا اور انکل بس دو ہی بھائی تھے۔ اس لیے بچپن سے ہی ہمارا آپس میں خاصا آنا جانا تھا مگر پچھلے سال جب ایک سادہ سی تقریب میں ہماری منگنی ہوئی تب جھک کے مارے میں نے وہاں جانے سے احتراز کرنا شروع کر دیا۔ صاعد ویسے بھی ذرا شوخ اور بے باک قسم کا تھا۔ اس نئے رشتے کے بعد اور بھی کھل گیا۔ دوسری جانب مجھے ماما کی طرف سے نہ تو ایسی تربیت ملی تھی نہ ہی اتنی چھوٹ کہ میں اس کی وارننگوں اور شوخیوں کا جواب اس کے من چاہے انداز میں دے سکتی۔ اس لیے میرا پیچھے پیچھے ہی رہنا مناسب تھا لیکن اب حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ مجھے ہمیشہ کے لیے یہاں آنا پڑ گیا۔ نہ صرف مجھے بلکہ میرے ساتھ مینو کو بھی۔ میں جب ایف ایس سی کے سکینڈ ایئر میں تھی اور مینو کلاس فور تھ میں۔ وہ خاصی بریلیٹ تھی اس لیے ذہن پر دموشن کے ساتھ عمر کے آٹھویں سال میں ہی نو تھ اسٹینڈرڈ تک پہنچ گئی تھی۔ ماما پاپا کی ذہنیت کے دسویں روز ہم یہاں آئے تھے اور وہ دس روز انکل نے اپنی فیملی کے ساتھ ہمارے گھر پر گزارے تھے۔ اوپر والے پورشن کے دو بند روز میں سارا سامان رکھ کے لاک

کرنے کے بعد انہوں نے جلد ہی نکلا پورشن کرائے پر اٹھا دیا۔ میرا اکاؤنٹ وہ پہلے ہی کھلوا چکے تھے۔ کرائے کی رقم اس میں باقاعدگی سے جمع ہونے لگی جو میرے اور مینو کے تعلیمی اخراجات کے لیے کافی تھی اور یہ میری ہی ذمہ داری تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ ہم دونوں ایک بوجھ کی طرح ان پر سوار ہوں حالانکہ ان کا اصرار تھا۔ یہ رقم جوں کی توں میرے اکاؤنٹ میں جمع رہے۔ ان کی محبت اپنی جگہ میری خود داری اس بات کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔

گزرتے وقت نے مجھے یقین دلایا کہ میرا یہ فیصلہ درست تھا۔ رواد یہ بھائی کا دھوپ چاؤں سا مزاج میری سمجھ سے باہر تھا۔ اگرچہ صائم بھائی سے ان کی شادی کو ڈیڑھ ہی سال ہوا تھا مگر نہ تو وہ میرے لیے انضباطی تھیں نہ میں ان کے لیے نئی چیز تھی۔ وہ صاعد کی خالہ زاد بھی تھیں یعنی آئی کی سگی بھانجی۔ اس ناطے یہ بات وہ بھی جانتی تھیں کہ میں اس گھر کی مہمان نہیں۔

آج نہیں تو کل مجھے یہاں آنا ہی تھا پھر ان کی ناگوار سی..... میں اس کی وجہ جاننے سے قاصر تھی۔ آئی کا رویہ نارمل تھا اور انکل کا پہلے سے کہیں بڑھ کے مشفق اور صائم بھائی کا اپنی نیگم کے حراز کے زیر اثر یعنی وہ خوش ہوتی تو یہ بھی خوش ان کی تیوریاں چڑھی ہوتیں تو صائم بھائی جان بھی منہ بجا نہ پھرتے۔ صائب اپنے آپ میں گن رہنے والا لڑکا تھا۔ حالانکہ وہ مجھ سے صرف ایک سال چھوٹا تھا اور تقریباً ہم عمر ہونے کی وجہ سے ہماری اچھی دوستی ہو سکتی تھی لیکن اس کے رویے میں میرے لیے بزرگوں والا احترام پایا جاتا تھا۔ شاید اس کے پیچھے بھی میری اور صاعد کی منگنی ہی ہو۔ یعنی بات گھوم پھر کے دیں آ جاتی تھیں۔ اگر مجھے صرف ایک بھینجی یا بیٹی بن کے یہاں رہنا پڑتا تو میں بہت جلد خود کو ایڈجسٹ کر لیتی مگر مجھے یہاں ہونے والی بہو کا انٹینس

حاصل تھا جو مجھے کھل کے جینے نہ دیتا تھا۔ ایک جھجکی برودت مانع رہتی۔ صاعد سے میں اور بھی کڑائی کڑائی پھرتی تاکہ کسی وجہ سے آئی اور بالخصوص رودادہ بھابی کو کسی اعتراض کا موقع نہ مل جائے اور وہ تھا کہ یہ بات سمجھنا ہی نہ تھا۔

”تم مجھ سے اتنی اکڑی اکڑی کیوں رہتی ہو؟“ ایک روز بچن سے نکلتے ہوئے وہ میرا راستہ روک کے کھرا ہو گیا۔ مجھے سخت کھبراہٹ نے آن گھیرا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ میرے ایف ایس سی کے فائل انکیزامز یہاں آنے کے چندہ سولہ روز بعد ہی شروع ہو گئے تھے۔ کتنے ہی دن تو میں نے کتابوں کو ہاتھ تک نہ لگایا تھا۔ آج سے باقاعدہ اسٹڈیز کرنے کا ہوش آیا وہ بھی انکل کے ٹوکنے پر۔ میں رات دیر تک جاگ کر پڑھنے کے لیے اپنے لیے کافی بنانے آئی تھی اور رات کے اس پہر جب بے شک سارے گھر والے اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لیے جا چکے تھے مگر میں جانتی تھی کہ وہ اب تک جاگ رہے ہوں گے۔ ایسے میں کسی کا بھی اسے میرے ساتھ یہاں دیکھ لینا میرے حق میں اچھا ثابت نہ ہو سکتا تھا۔ یہ بات درست تھی کہ اب یہی گھر میرا ٹھکانا تھا اور اب مجھے یہاں سے کہیں اور جانا بھی نہیں تھا اس کے باوجود میں اب تک خود کو اس گھر میں مہمان تصور کرتی تھی اور میری لاما کی جو تربیت تھی اس پر عمل پیرا ہوتے ہوئے مدد و ہمتا د رہنا چاہتی تھی۔

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟“

”تم..... تم پلیز جاؤ یہاں سے۔“ دہی سورت بنا کے میں نے کہا۔ یقیناً میری آواز بھی کیکی لپٹی گئی جس سے متحفظ ہوتے ہوئے وہ اور بھی پھیل گیا۔

”نہیں جاتا۔“

”تو پھر مجھے تو جانے دو۔“ میں نے منت کی۔

لاؤنج کی لائسن بھابی اپنے بیڈروم میں جاتے ہوئے آگ کر گئی تھیں۔ اس نیم تاریک سکوت میں ہمارا اکٹھے ہونا اور بھی محبوب نظر آ رہا تھا۔

”تم چلی گئیں تو میں یہاں اکیلے کیا کروں گا۔“

”تم بھی اپنے کمرے میں چلے جانا۔“ اس بار میں نے تحمل سے کام لینے کی کوشش کی اور آواز دبا کے کہا۔

”اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔“ اس نے منہ بنایا۔ ”اُدّ کچھ دیر بیٹھ کے باتیں کرتے ہیں اچھا سایدزک سنتے ہیں۔ تم نے تو خود کو بالکل ہی محدود کر کے رکھ لیا ہے نازو۔ اپنے آپ کو ایک موقع تو دوغرم کی اس دھند سے باہر نکلنے کا۔ اپنے آپ کو نہ کسی کسی اور کو ہی سہی۔ ایٹ لیسٹ مجھے۔ کیا تم مجھے بھی موقع نہ دو گی کہ میں تمہارا درد بانٹ سکوں۔ اندر ہی اندر گھٹ کے تم اپنی صحت تباہ کر لو گی۔“ وہ مسلسل کہتا جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ لاؤنج کی لائسن آن کرنے کے بعد ادائیگی پر نہ جانے کون سا جینیل ڈھونڈ رہا تھا اور میں اس کی باتوں کو بے دھیانی سے سنتے ہوئے گھبرائی ہوئی نظروں سے لاؤنج میں کھلنے والے انکل آئی کے اور صائم، صائب کے بیڈروم کے بند دروازوں کی جانب دیکھ رہی تھی۔ صائب کے کمرے کی تو لائسن بھی آن تھیں جس کا مطلب تھا کہ صائب اب تک جاگ رہا ہے اور آئی کی نیند تو خاصی کچی تھی وہ بھی جہاں تک کے دیکھ سکتی تھیں۔ پتا نہیں انہیں کیا لگتا یہ سب۔ سب سے زیادہ ڈر مجھے بھابی کی جانب سے تھا۔ اوپر والے پورشن میں ہم دونوں کو ان کے بیڈروم کے بالکل سامنے والا کمرہ ملا تھا۔ جب میں کافی بنانے نیچے آ رہی تھی تب انہوں نے سرسری سے انداز میں مجھ سے پوچھا بھی تھا۔ وہ کوریڈر کے پردے برابر کر کے اور لاک وغیرہ چیک کر کے اب اپنے کمرے میں جا رہی تھیں۔ مجھے نیچے آئے خاصا وقت ہو گیا تھا۔

وہ تجس کے مارے نیچے بھی آ سکتی تھیں۔ صاعد کی ذرا سی بے احتیاطی میرے وجود کو سب کی نظروں میں ہلکا کر سکتی تھی۔

”ارے یہ کیا؟ تم اب تک یہ ایک ہی کب تھ میں لیے کھڑی ہو۔ یعنی دیر سے تم دیدے گھما گھما کے سارے گھر کا جائزہ لے رہی ہو اتنی دیر میں تم ایک کپ کافی مزید بنا سکتی تھیں۔ خبر جاؤ اب بنا لاؤ مگر فاسٹ..... دومنٹ میں۔“ اس نے غلو رکشن پر مچھلکے ہوئے کہا۔ میں نے اپنا کافی کالک اس کے آگے رکھ دیا۔

”تم یہ لے لو مجھے واپس اوپر جانا ہے۔ مینو اکیلے ہوگی دیر جائے گی۔“

میری بات پر وہ کتنی دیر تک چاپ چاپ مجھ دیکھتا رہا۔ میں بھی خاموشی سے پلٹی اور بیڑیاں چڑھنے لگی۔ ابھی دوڑنے ہی طے کیے تھے کہ اس کی بھیجی بھیجی سی آواز سنائی دی۔

”میرے اکیلے پن کا احساس نہیں ہے تمہیں!“

”اللہ نہ کرے صاعد جو تمہارا دروازہ اس اکیلے پن سے ہو جو میری مینو کو عمر کے محض آٹھویں برس بھینا پڑ رہا ہے۔“ اور یہ بات میں صرف سوچ کے رہ گئی تھی۔ ان دنوں میں اس کے سامنے کھلنے میں بہت جھجک محسوس کیا کرتی تھی۔

”مجھے پڑھنا بھی تو ہے۔“ بغیر پلٹے میں نے جیسی آواز میں ایک اور بہانہ بنایا جو ایک لحاظ سے سچ بھی تھا۔ چند سینکڑوں ویں رک کی اس کی اگلی بات کا انتظار کرتی رہی پھر آگے بڑھ گئی۔ شاید اس نے میری بات سنی ہی نہ تھی اور اگر سنی تھی تو ناراض ہو کر مزید کچھ کہنا گوارا ہی نہیں کیا تھا۔

ماما پاپا دونوں کے سامنے سے اچانک محروم ہونا ایسا حادثہ نہ تھا جسے آسانی سے بھلا یا جاسکتا۔ اس لیے ان حالات میں جیسے پیچھے ہو سکتے تھے میں نے دیے اور ان کا

زلزل بھی دیا ہی آیا جیسا کہ آنا چاہیے تھا۔ اتنے کم مارکس کے ساتھ میرا میڈیکل میں ایڈمیشن ہونا ناممکن تھا۔ مجھے اپنے مارکس کم آنے کا اتنا افسوس نہ تھا جتنا غم اس بات کا تھا کہ میں ماما کی خواہش پوری کرنے میں ناکام رہی ہوں۔ میں نے رورو کے آنکھیں سجالیں۔ اٹکل چاہتے تھے میں بی ایس ی میں ایڈمیشن لے لوں مگر دل برداشتہ ہو کے میں تو پڑھائی ہی چھوڑنے پر تیار تھی۔

آئی نے میری دل جوئی کی خاطر کہہ دیا کہ آخری فیصلہ میرا ہوگا۔ اگر میں چاہوں تو پڑھوں نہ چاہوں تو بے شک نہ پڑھوں مگر ان کی اس بات کی مخالفت صاعد نے زور شور سے کی۔

”وہ تو بے وقوف ہے آپ ہی اسے کچھ عقل سکھائیں نہ کہ اس کے جذباتی اور احمقانہ فیصلے کی تائید کریں۔“

اس تجربے پر میں نے روئی روئی آنکھیں اٹھا کے اسے شامی انداز میں دیکھا جسے وہ خاطر میں نہ لایا۔

”وہ ایک انتہائی بڑے فیصلہ کر رہی ہے اور آپ کہہ رہی ہیں کہ وہی ہوگا جو وہ چاہتی ہے۔ جن لوگوں کو جذبات میں اندھے ہو کر اپنے اچھے برے کی تمیز نہ رہے انہیں اتنے بڑے اختیارات نہیں دینا چاہئیں۔ اگر کوئی اس کا بھلا چاہتا ہے تو پھر اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لے یا تو یہ پایا کی بات مان لے۔ بی ایس ی میں اس کا ایڈمیشن بہ آسانی ہو سکتا ہے۔ میڈیکل لائن میں کیریئر صرف ڈاکٹر بن کے ہی تو نہیں بنایا جاسکتا اور اگر یہ اسے پسند نہیں تو دوبارہ تیاری کر لے۔ اگلے سال پھر پیچھے دیے جاسکتے ہیں۔“

”دوبارہ؟“ میں نے آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔ یہ خیال تو میرے دماغ

”ہاں۔“ ظاہر ہے تو ایسا کر سکتی ہو اسی لیے تو مرنے پہ لائن چلی۔ وہ تو حالات کچھ ایسے رہے کہ تمہارا رزلٹ ویسا نہ آ سکا جیسا آنا چاہیے تھا۔ اس باز ذرا ریلیکس ہو کے ذل و دماغ کو ہلکا پھلکا کر کے تیاری کرو۔ سارا دھیان اپنے مقصد کی جانب رکھو۔ میں شہر کی ٹاپ اکیڈمی میں تمہارا ایڈیشن کر ادیتا ہوں۔ فرسٹ کلاس تیاری ہو جائے گی۔“

”اور وہ جو ایک سال ضائع ہو گا۔“ آنٹی نے نکتہ پیش کیا۔ وہ پہلے ہی میری میڈیکل کی تعلیم سے کچھ خاص راضی نہ تھیں۔ شاید اس کی طوالت کی وجہ سے۔

”ایک سال گزرنے میں کون سا وقت لگتا ہے۔“ اس کی اس بات کی تائید میری خاموشی نے کی اور یوں میں ایک بار پھر نئے جذبے اور لگن کے ساتھ میڈیکل میں جانے کی تیاری کرنے لگی۔

اگرچہ آنٹی دل سے اس بات کو پسند نہ کرتی تھیں کہ میں اس جھیلے میں پڑوں مگر میری خواہش اور اما کا خواب مجھ کے چپ تھیں۔ ایک سیدھی سادی خاتون کی طرح وہ شاید یہ چاہتی تھیں کہ میں اگلے ڈیڑھ دو سالوں میں گریجویشن کر لوں جو ان کی نظر میں کسی لڑکی کے لیے مناسب ترین تعلیم تھی اور ان کی باقاعدہ بہن جاؤں۔ ان سب کے باوجود جب میں نے اکیڈمی جوائن کر لی تو انہوں نے میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔

میرے شام کی کلاسز تھیں۔ دن کو جو میں اپنی خوشی سے گھر کے کسی کام میں حصہ لیتی تھی وہ بھی انہوں نے ایک محبت بھرے زور کے ساتھ کم کر دیا۔ وہ میری یکسوئی کا مکمل دھیان کر رہی تھیں۔ تاکہ اس بار میں ناکام نہ ہوں لیکن اس بھاری بار میری یکسوئی

میں اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی مگر کچھ ماہ کا عرصہ گزرنے کے باوجود اب تک دل سے ماما پاپا کی دائمی جدائی کا شدید صدمہ کم کرنے میں ناکام تھی اور وہ تو ایک آٹھ سال بچی تھی۔ ایک ایسی بچی جس نے آنکھ کھلتے ہی صرف اور صرف اپنے ارد گرد دھتتیں ہی دیکھی تھیں۔ ابھی اس نے اپنے جھسے کا پیاری بھر کر سیمینا ہی کہاں تھا کہ وہ تہی داماں ہو گئی۔ جب وہ ماما کو پھل پھل کے پکارتی تو مجھ سے اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ وہ اب تک اس گھر میں ایڈجسٹ نہ ہو پا رہی تھی۔ اسے اپنا گھر اپنا کمرہ اپنا بیڈ اور اپنے ماما پاپا چاہیے تھے جو میں اسے لا کر نہ دے سکتی تھی۔ البتہ میں اسے بہلا ضرور سکتی تھی اور پچھلے پانچ ماہ سے میں یہی تو کر رہی تھی۔ اب جب میں اپنی اسٹڈیز میں دوبارہ مصروف ہو گئی تو اسے میری اوقات اور توجہ کم ملنے لگی۔ نتیجتاً وہ مزید چڑچڑی ہو گئی۔

جب شام کو میں اکیڈمی جانے کے لیے تیار ہوتی تو وہ جان بوجھ کر خود کو دواش روم میں بند کر لیتی تاکہ میں اس کے انتظار میں لیٹ ہو جاؤں۔ ایک دو دن ایسا کرنے کے بعد میں اسے دروازہ ناک کر کے ”بانے بانے“ کہنے کے بعد جانے لگی تو واپسی پر وہ مجھے دوبارہ دواش روم میں بند ملی۔ آنٹی سے پتا چلا کہ اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ مجھے اس روز خاصا کام کرنا تھا لیکن اسے بہلانے اور منانے میں میرے دو ڈھائی گھنٹے صرف ہو گئے۔ رات گئے اسے کہانی سنا کے سنانے کے بعد جب میں پڑھنے بیٹھی تو میرا دماغ ناؤف ہو رہا تھا۔ میرے اعصاب تناؤ کا شکار تھے۔ ایک لفظ بھی میرے پلے نہ پڑ رہا تھا۔ اگلے دن مجھے لائبریری جانا تھا۔ یہ بات میں انکل کو رات واپسی پر بتا چکی تھی۔ شام کو اکیڈمی جانے کے لیے انہوں نے مجھے وین لگوا کر دی تھی لیکن رات کو چونکہ دیر ہو جاتی تھی اس لیے وہ آفس سے واپسی پر خود مجھے پک

کرتے تھے۔ ناشتا کرنے کے دوران انہوں نے صاعد سے کہا کہ وہ یونیورسٹی جاتے ہوئے مجھے لائبریری چھوڑ آئے۔

”آپ کہیں نہیں جاؤ گی۔“ رات کو میں نے اسے منانے کی خاطر بڑے لمبے چوڑے وعدے کیے تھے جن کے زیر اثر وہ مجھ پر باقاعدہ حکم چلا رہی تھی۔
”میو میو میری جان مجھے صرف ایک گھنٹے کے لیے جانا ہے۔“ میں نے اس کے لبوں سے جوں کا گلاس لگاتے ہوئے منت بھرے انداز میں کہا مگر اس نے سختی سے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ جس بھٹک کے گر پڑا۔

”آپ نے کہا تھا آپ رات کو بھی جلدی آیا کرو گی اور بیٹے میں تین دن چھٹی بھی کیا کرو گی۔ جبکہ آپ آج دن کو بھی مجھے اکیلا چھوڑ کے جا رہی ہو۔“ وہ منہ چھپا کے رونے لگی۔ اگرچہ اس کی ضد مجھے زچ کر رہی تھی مگر اس کے آنسو میرا دل پگھلانے لگے۔ میں اس کے بال سہلا کے خاموش کرانے لگی۔

”اچھا..... پلیز رو مت۔ نہیں جاتی میں۔“ بلاخر اس کے آنسوؤں کے آگے میں نے ہار مان لی۔ اب تک سب خاموشی سے ناشتا کر رہے تھے۔ کسی نے ہماری گفتگو کے دوران دخل نہ دیا تھا۔ البتہ کپ میں چائے ڈالتے ہوئے رودادہ بھابی نے دبے لفظوں میں یہ تبصرہ ضرور کیا۔

”پھر تو ہو چکی پڑھائی۔ فضول میں ایک اور سال.....“ باقی کے فقرے پتا نہیں انہوں نے دل میں ادا کیے تھے یا منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے جو وہ مجھ تک نہ پہنچے۔

”رودادہ.....“ انکل نے انہیں تنبیہ ٹوکا۔

”چلو میو تمہاری اسکول وین آگئی ہے۔“ صائب نے اس کا بیگ اٹھایا۔ وہ مجھ

سے پلٹ گئی۔

”پیا! آج میرا ہاف ڈے ہے۔ میں واپس آؤں تو آپ مجھے گھر پر ملیں.....“
اوکے!“ اس نے انگلی کھڑی کر کے تاکید کی۔

”گڈ ہاف ڈے۔“ صاعد نے اسے مخاطب کیا۔ ”آج تو میرا بھی ہاف ڈے ہے۔ کیوں نہ میو ڈیئر! آج کوئی آؤنگنگ کا پروگرام بنایا جائے۔“ میو مجھے دیکھنے لگی۔
”اپنی پیا کا منہ کیا دیکھ رہی ہو یا ز ہاف ڈے تو ہم دونوں کا ہے اس کا تھوڑا ہی ہے۔ یا ز جانے دو بے چاری کو اکیڈمی چھٹی کرے گی تو اس کی ٹیچرز خوب پٹائی لگا دیں گی۔“

”کوئی نہیں جی۔“ میو نے سمجھ داری سے گردن ہلائی ”کالج میں ٹیچرز ملشمنٹ نہیں دیتیں۔“

”لو تمہیں کیا پتا“ بڑی کلاس کی ٹیچرز بھی بڑی ہوتی ہیں۔ خوب لمبی چوڑی۔ مار بھی زیادہ پڑتی ہے بالکل ویسے ہی جیسے پڑھائی بھی زیادہ ہوتی ہے۔ کیوں بے چاری کی شامت لانا ہے چھٹی کر داکے۔ تم اپنا بتاؤ“ چلتی ہو شام کو میرے ساتھ جوائے لینڈ۔“

یہ ایک بہت بڑا لالچ تھا میو کے لیے۔ کیونکہ جوائے لینڈ اس کا فیورٹ اسپاٹ تھا۔ اس کی آنکھیں چمک انھیں مگر اس کی خاموشی اس کا تذبذب ظاہر کر رہی تھی۔ اتنے میں وین نے دوبارن اکٹھے بجا دیے۔ ساتھ ہی صائب کی پکار۔

”ہری اپو میو۔“

”تو پھر ڈن!“

”تو پھر ڈن!“ صاعد نے ہاتھ آگے کیا۔

”ڈن“۔ وہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتی باہر نکل گئی اور میرے سر سے جیسے ایک بھاری بوجھ سرک گیا۔ رات پڑھائی بھی ڈھنگ سے نہ ہو سکی تھی اور آج اگر لائبریری نہ جانی تو میرا بہت حرج ہوتا اور جو اسے ناراض کر کے جاتی تو واپسی پر اسے منانے میں جو گھنٹے صرف ہوتے ان کا تصور لائبریری جا کے بھی سکون سے کام نہ کرنے دیتا۔

”تھینک یو صاعدا“ لائبریری جانے کے لیے اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے میں نے کہا۔ میں اس کے ساتھ کبھی بھی آنے جانے سے احتراز کیا کرتی تھی۔ اس کے کہنے پر بھی کوئی نہ کوئی بہانہ صفائی سے گھڑپا کرتی۔ حتیٰ کہ اس کے ساتھ لان میں واک کرنے کی آفر پر بھی۔ آج اس لیے گئی کہ ایک تو یہ اکل کا آڈر تھا اور سارے گھر کے سامنے ہی ملا تھا اور دوسری بات یہ کہ صاعدا کیلے یونیورسٹی نہیں جاتا تھا بلکہ صائب کو ڈراپ کرتا ہوا جاتا تھا۔ صاعدا کے ہارن دینے پر میں اور صائب اکٹھے ہی باہر نکلے اور جب صائب فرنٹ سیٹ کا دروازہ میرے لیے کھول کے خود پیچھے بیٹھ گیا تو میں کچھ کہہ بھی نہ سکی۔ البتہ کچھ دیر بعد ہی میں نے اس کا شکریہ ضرور ادا کر دیا۔

”اس میں تھینک یو کہنے والی کیا بات ہے۔ پاپا نے کہا تھا“ جانے لگا تو تھا ہی۔

ورنہ ان کی چیت چیت جی کا ڈرا یور بننے سے انکار کر کے سرعام تھیں کھانا پڑتیں۔ ویسے بھی تمہاری لائبریری میرے رستے میں ہی آتی ہے۔ تم خواہ تو اہانا اتار پڑ کلف قسم کا مرصع و شستہ تھینک یو ضائع مت کرو۔“

”میں اس کی بات نہیں کر رہی۔“ اتنے لمبے بیان پر میں چڑ گئی۔ ”وہ مینو..... میرا مطلب ہے وہ مجھے.....“ بہت عجیب سا لگ رہا تھا یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ مینو کی وجہ سے میں پریشان تھی یا وہ میرے لیے مسئلہ پیدا کر رہی تھی۔ مجھے ان دونوں میں سے کسی کا بھی اعتراف کرنا مناسب نہ لگا۔

”تم اسے گھمانے کے لیے باہر لے جا رہو اس کے لیے تھینک یو۔“ بلا خر مجھے معقول قسم کے الفاظ مل ہی گئے۔

”ایک اور تھینک یو ضائع کر دیا۔“ اس نے افسوس کے انداز میں سر ہلایا۔

”اگر اس بات پر میں شکریہ کا مستحق بنتا ہی ہوں تو یہ تھینک یو خود مینو کو کہنا چاہیے لیکن میرا خیال ہے اسے نہیں بلکہ مجھے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ وہ میرے ساتھ جوئے لپیٹ جانے پر تیار ہوئی۔ تمہیں تو پتا ہی ہے کہ وہاں ڈاؤنٹ فمیلی انٹری نہیں ہو سکتی اور میں کب سے چل رہا ہوں وہاں جانے کو۔ جھولے لینے کو ڈاؤنٹ کار میں بیٹھ کے دوسروں کو ٹکڑیاں مارنے کو۔ ٹرین میں بیٹھ کے اونچی آواز میں گانا گانے کو گرگیا کروں، چمچے پھانٹ کو ٹکٹ ہی نہیں ملتی۔ آج مینو جی کے طفیل ہم بھی تھوڑی مروج سرتی کر لیں گے تم چلو گئی؟“

”میں.....“ اچانک اس کی آفر پر میں حیران رہ گئی۔ وہ جانتا بھی تھا کہ میں مینو کی ضد سے کتنی پریشان تھی اور وہ خود مجھے ساتھ چلنے کو کہہ رہا تھا۔

”ہاں..... تم تیار ہو تو ہم شام کو چلے ہیں۔ مینو کو میں تب تک کہیں اور گھما پھرا کر بہلائے کھوں گا۔“

”نہیں“ تم تو جانتے ہو مجھے چھ بجے اکیڈمی کے لیے نکلنا ہوتا ہے۔“

”اس سے پہلے؟“

”مجھے پڑھنا ہے۔“ یہ بہانہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے میں لائبریری جبک مارنے تو نہیں جا رہی تھی۔

”اور تمہارے آنے کے بعد تو بالکل بھی نہیں۔ ظاہر ہے کہ تم ساڑھے نو بجے آتی ہو۔ تھکی بھی ہوگی اور.....“ اس نے خود ہی اپنے آپ کو جواب دے کر تسلی دا دی۔

واقعی میں تھی ہوتی اور یہ بھی کہ آئی رات کو میرا نکلتا پسند نہ کرتیں۔ رات دس بجے تفریح کے لیے نکلنے تو واپسی بارہ بجے ہی ہوتی۔ ایسی آزادی کا ہمارے ہاں تصور نہ تھا۔

اگلے پانچ سات منٹ تک ہمارے درمیان خاموشی رہی۔ صائب کو ہیلے کالج کے سامنے اتار کر اس نے پھر مجھے مخاطب کیا۔

”پتا ہے نازو! دل چاہتا ہے میں کچھ وقت تمہارے ساتھ اکیلے گزاروں بالکل اکیلے۔“ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ میں نازنین محمود جو ہمیشہ اس کی پیش قدمی کی حوصلہ شکنی کر دیتی تھی اس بار شدت سے چارہ رہی تھی کہ اس کی یہ خواہش پوری کر دوں۔ میں نے سر اٹھا کے ارد گرد دیکھنا چاہا۔ ہم کیپس نہر سے گزر رہے تھے۔ اوائل گرمیوں کے دن تھے۔ ابھی دھوپ میں وہ شدت پیدا نہیں ہوئی تھی۔

”یہاں کچھ دیر بیٹھ جائیں؟“ بہت اٹک اٹک کے بمشکل میں اتنا ہی کہہ پائی۔ اس نے اسپینڈ سلو کر دی اور میرے نزدیک ہو کر سرگوشی کی۔

”میں نے کہا..... اکیلے..... بالکل اکیلے.....“ میں نے ایک بار پھر نظر اٹھا کے دیکھا۔ نہر کے کنارے اور نکڑی کے بل پر بہت سے اسٹوڈنٹس آ جا رہے تھے۔ سڑک پر ٹریفک رواں تھی۔ اس کے الفاظ میں نے دل میں دہرائے اور ایسی عجیب اور قریب قریب ناممکن سی خواہش پر میرا دل ایک بار پھر زور سے دھڑک گیا۔ میں نے دوبارہ سر جھکا لیا۔ وہ ہولے سے فیس پڑا۔

”ہو سکتے تو میرا ایک کام کرو.....“

شام کا ایک پہر میرے نام نہام کرو.....“

وہ گنگنا نے لگا اور میں گھبراہٹ سے اٹھیاں مسلتی ہوئی باہر نکلنے لگی۔ شکر ہے کہ دو تین منٹ بعد ہی اس نے مجھے لائبریری کے آگے اتار دیا۔ یہ دو تین منٹ بھی اس کی سلوڈرائیوگ کی وجہ سے گئے..... ورنہ لائبریری پہلے کالج کے بالکل نزدیک ہی تھی۔ اس دن میں نے بہت ہڈ سکون انداز میں اپنے نوٹس تیار کیے حالانکہ ایک پرفیسر سی سرگوشی بار بار مجھے ڈسٹرب کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

”اکیلے..... بالکل اکیلے.....“

عجیب بات یہ تھی کہ اس کا تصور میرا جی بھاری کرنے کے بجائے میرے اندر اور بھی تیزی اور لگن پیدا کر دیتا تھا۔ میں نے پورے دل سے یہ تسلیم کیا کہ اگر میں آج دل پر مینو کی ناراضی کا بوجھ لے کر آتی تو واقعی دل جمعی سے پڑھ نہ پاتی۔ گھر واپس جاتے ہوئے میں نے مینو کے لیے چاکلیس لیں مگر وہ گھر پر موجود نہ تھی۔

”ابھی ابھی صاعد کے ساتھ گئی ہے۔“ آئی نے بتایا۔ شام ڈھلے ان کی واپسی ہوئی جب میں اکیڈمی جانے کے لیے بس نکلنے ہی والی تھی۔ مینو بے تحاشا خوش تھی۔ قہقہے اس کے ہونٹوں سے ابل رہے تھے اور اس کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھی۔

”جیا! میں نے اتنے راؤنڈز لیے..... اتنے راؤنڈز لیے کہ بس..... صاعد بھی مجھے سند با دھجی لے گئے تھے اور ہم نے کنگز اینڈ کونز میں پڑا کھایا اور..... اور ہم نے پاپ کارن لیے۔ گلیشیر سے کون کھائی۔ یہ کاکس بھی صاعد بھیانے لے کر دیے۔“ مارے ایکساٹمنٹ کے اس کی زبان فرانے بھر رہی تھی۔ کبھی وہ مجھے اپنی ایک کام کب کس دکھانے لگتی، کبھی ٹرین میں بیٹھ کے کی گئی شراتیں سناتے لگتی۔ کبھی کچھ کبھی کچھ۔

ماما پاپا کی ڈبہ کے بعد آج میں نے اسے کھل کے ہنسنے ہوئے دیکھا تھا اور وہ بھی اپنی

محسوس کیا۔

کیا تھا یہ؟ محبت..... اگر ہاں تو اس قدر اچانک.....؟ یا پھر ممنونیت کے اظہار نے کچھ اور ہی شکل اختیار کر لی تھی؟ جو بھی تھا گرا ب صاعد میرے لیے اتنا اجنبی نہیں رہا جتنا میں اسے محسوس کیا کرتی تھی۔ میرے گریز اور جھجک روز بروز گھٹنے لگے۔ اس میں یقیناً بڑا ہاتھ اس کا بھی تھا۔

وہ مینو کے لیے وہ سب کچھ کر رہا تھا جو میں کرنا چاہتی تھی مگر کر نہیں پا رہی تھی۔ اس گھر نے واقعی بڑی فراخ دلی سے ہم دونوں کا وجود قبول کیا تھا لیکن مینو جن حالات سے گزر رہی تھی اس کا تھا تھا تھا کہ اس سے غیر معمولی رویہ برتا جائے جس کی ضرورت کسی نے محسوس نہ کی۔ سب کا خیال تھا کہ جس طرح میں نے روایتی ہمدردانہ رویوں کا کافی جانے ہوئے خود کو سنبھال لیا ہے اور اس دھچکے سے سنبھل کر خود کو اپنی پڑھائی میں گمن کر لیا ہے مینو بھی سب بھول بھال جائے گی لیکن میری اور اس کی عمر میں فرق تھا۔ اسی طرح ہماری ذہنی کیفیات بھی مختلف تھیں۔ وہ بھی اس صدمے سے نکل سکتی تھی مگر تب جب کوئی اس کا ہاتھ تھام کر باہر نکالنے کی کوشش کرتا اور یہ کوشش اب صاعد کر رہا تھا۔ میں نے بھی کرنا چاہتی تھی مگر میں ایک وقت میں ایک جانب ہی توجہ رکھ سکتی تھی۔ اکیڈمی سے جو وقت چلتا گھر میں بھی کچھ گھٹنے پڑنا پڑھنا۔ فارغ وقت میں میری کوشش ہوتی کہ آئی اور بھابی کی مدد کرتے ہوئے کوئی نہ کوئی گھر کا کام بھی نہنا لوں۔ آئی منع بھی کرتیں لیکن بھابی کے ماتھے کی تیوریاں مجھے انجانے خدشات میں مبتلا کرتیں۔ مینو مجھ سے جس توجہ اور وقت کی متقاضی تھی وہ میں دینے سے قاصر تھی اور ساعد نے میری ذمہ داری بڑی خوب صورتی سے بانٹ لی تھی۔ وہ اسے سائیکلائنگ لے لیے لے کر جاتا۔ پیٹن شو دکھانے لے جاتا۔ کبھی برگر، کبھی آئس کریم کھلانے

کسی کوشش کے بغیر۔ اس کی مسلسل ہنسی میرے دل کو ہلکا چھلکا اور شاداب کرتی جاری تھی۔

”پلیز صاعد اس بارے میرے تھینک یو کو مصالح مت ہونے دینا۔ یہ میں دل سے کہہ رہی ہوں۔“

”تمہارا دل تھینک یو کی گردان کرنے کے علاوہ اور بھی کچھ کہتا ہے؟ اگر ہاں تو کبھی وقت ملنے پر وہ بھی سنایا۔“ اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا..... میں گڑ بڑا گئی۔

”آج مینو کتنی خوش ہے۔“ میں نے اس کی توجہ خود سے ہٹانا چاہی مگر ناکام رہی۔

”اور تم؟“

”مینو کو خوش دیکھ کر مجھے بھی خوشی ہی ہو رہی ہے۔“

”اور مجھے تمہیں خوش دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔“ اس نے بہت سادہ الفاظ میں بتایا کہ جس طرح میرا دل مینو کی خوشیوں سے وابستہ تھا اسی بندھن میں وہ اپنے دل کو میرے دل سے بانڈھ چکا تھا۔

وہ ہمیشہ سے ایسی ذومعنی باتیں کرنے کا عادی تھا۔ میں کبھی جڑ بڑھ جاتی، کبھی اس کی جسارت پر ہلکی سی ناگواری بھی محسوس ہوتی اور کبھی کبھی اس کی موجودگی میں اس کی یہ حرکتیں مجھے خفت میں مبتلا کر دیتیں لیکن آج کچھ تھا..... کچھ تو تھا جو اس کے فقرے پر اس کی ہر نظر پر میرے ارد گرد ایک گرم ایک لے سی پھڑپھڑاتی اور شاید میرے دل کو یہ سر کچھ زیادہ ہی پسند آئے تھے جو وہ ان کے بکھرتے ہی مست ہو کے ناچنے لگ جاتا تھا۔ میں نے حیرت سے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کے اس کی تیز ہوتی ہڑکن کو

تو کبھی پلے لینڈ۔

گھر پر بھی وہ اسی کے ساتھ وقت گزارتا۔ اکثر وہ دونوں لان میں بیٹ بال کھیلتے نظر آ رہے ہوتے۔ کبھی کارٹون اکٹھے بیٹھ کے دیکھ جاتے۔ کبھی وہ اس سے ہزار بار کے سنے لطف ایک بار پھر سن رہا ہوتا اور اس کا دل رکھنے کو زور زور سے قہقہے بھی لگا رہا ہوتا۔

وہی تھا جس کی کوششوں کی بدولت میری میری مینو مجھے ویسی ہی واپس ملی جیسی کہ وہ تھی۔ ہنستی کھکھلاتی، مسکراتی میری پیاری بہن مینو۔ اب میں قدرے سکون کے ساتھ اپنی پڑھائی میں لگن ہو گئی۔ سخت محنت اور لگن کی بدولت میرا ایف ایس سی کا رزلٹ شان دار آیا۔ میرا ایڈمیشن فائل فائیل جتنا چمک چمک رہی تھی۔ اب اس کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزار پاتی تھی۔ کبھی ایکسٹرا تھی۔ اگرچہ میں اب اس کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزار پاتی تھی۔ کبھی ایکسٹرا کلاسز..... کبھی پریکٹیکل کھوتو کبھی وارڈز میں ڈیوٹی۔ ایم بی بی ایس کے سخت محنت والے سال گزار رہے تھے اس کے باوجود جب میں گھر ہوتی اور فارغ ہوتی تو مینو کو گھر پور وقت دیتی۔ اب اس کے پاس صاعد کے ذکر کے علاوہ اور کوئی بات ہی نہ ہوتی تھی۔ مزے کی بات تو یہ تھی کہ میں بھی اس کا ذکر سن کے تنک نہ آتی تھی۔ وہ نان اسٹاپ صاعد کی باتیں اس کی تعریفیں اس کے قصے سنائے پلے جاتی اور میں محبت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے مسکراتی رہتی۔ میری آنکھوں میں اس کے خوشی سے معمور چہرے کی جھجکا ہٹ اترے کھٹک پیدا کرتی اور کانوں کے رستے صاعد کے نام کا ورد میرے دل میں اجالے بکھیرتا جاتا۔

وہ مینو ہی تھی جس کے ذریعے میں صاعد سے ایک نئے رشتے میں بندھی۔ وہ

ہمارے درمیان ایک ایسی ڈور تھی جس کے سرے دونوں جانب ہی مضبوطی سے بندھے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانچ سال مزید گزر گئے۔ میری زندگی میں اگر کوئی تبدیلی آئی تو صرف اتنی کہ اب میں ایم بی بی ایس کے فائنل ایئر میں تھی اور اپنی ٹین ایج گزار کے ایک بائیس سال کی پیچور لڑکی بن چکی تھی۔ میری طبیعت پہلے ہی سنجیدگی کی جانب مائل تھی اب پیچور ہونے کے احساس نے اور تعلیم کی مصروفیت نے اور بھی اپنی ذات میں گم کر دیا تھا۔

البتہ گھر کے حالات میں خاصی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ انکل ریٹائر ہو چکے تھے۔ آنٹی بلڈ پریشر اور جوڑوں کے درد کے عارضے میں مبتلا ہو چکی تھیں۔ رواد بہا بہائی میرے آنے کے بعد مشکل ایک ڈیڑھ سال گزار سکیں اس گھر میں اور پھر صائم بھائی جان کو لے کر الگ ہو گئیں۔ صائب پچھلے سال اعلیٰ تعلیم کی غرض سے انگلینڈ گیا تھا۔ صاعد کو ایک ملٹی پھیزل کپٹن میں اچھی جاب مل گئی تھی۔ مینو اب ایول کر رہی تھی اور تیرہ سال کی عمر میں اس نے اب کہیں جا کے قد کاٹنا شروع کیا تھا۔ اس کا جسم بچپن سے ہی فربہ کی جانب مائل تھا، کچھ خوش خوراک بھی تھی۔ بچپن کی معصومیت ابھی اس کے چہرے سے رخصت نہیں ہوئی تھی اور قد بھی تیرہ سال کی بچی کے بجائے دس گیارہ سال کی بچی کے برابر ہی تھا۔ اس لیے وہ اپنی عمر سے بھی کم ہی لگا کرتی۔ البتہ اس کی ذہنی صلاحیتیں بلاشبہ اپنی عمر سے بہت آگے تھیں۔ کبھی کبھی تو وہ اپنی ذہانت سے مجھے حیران کر دیا کرتی تھی۔

صاعد سے اس کی وابستگی پہلے سے کئی گنا زیادہ تھی اور صاعد کی میرے لیے یوانگی بھی جوں کی توں تھی۔ اب بھی اس کی آنکھوں میں میری صورت دیکھ کے تارے چمکا کر تے تھے۔ اب بھی اس کے لب میرا نام پکار کے گونگناہٹ لگتے تھے اور

میں..... میں بھی اب تک اس کے معاملے میں وہی تھی اور میرا دل بھی۔ وہی اپنا پرانا چلن نہ چھوڑنے والا دل۔ وہی اس کی شوخ نظروں اور بے باک فکروں پر گھبرا کے کچھ شپٹا کے دھڑ دھڑ چما دینے والا دل۔ وہی میری خاموشیاں۔ وہی اس کی وارفتگیاں۔

میں اپنا آخری پریکٹیکل دیکر گھر لوٹی تو دل و دماغ بہت جگہ پھسلنے لگے تھے۔ بلاخر میں اپنی منزل کو پانے والی تھی۔ اپنی ماما کا خواب سچ ثابت کرنے والی تھی۔ میں نے سوچا تھا رزلٹ آنے تک کا سارا عرصہ مینو اور صاعدا کے ساتھ گزاروں گی۔ ان دونوں کے وہ تمام گلے شکوے دور کروں گی جو انہیں میری ذات سے تھے اور کسی حد تک بجاتے لیکن گھر لوٹنے ہی میں نے ماحول میں ایک عجیب سی اداسی کھلی دیکھی۔ انکل چپ چاپ سے ٹیبل پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پر گہری تنہائی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ ان کے کچھ اندازہ لگانے میں ناکام ہو کر میں نے آنٹی کو دیکھنا چاہا۔ ان کی آنکھوں سے لگ رہا تھا کہ وہ روتی رہی ہیں۔ میرا دل دھل گیا۔ تقریباً تمام ہی قریبی عزیز رشتے داروں کے چہرے میری نگاہوں کے سامنے بھرنے لگے۔ کبھی دھیان صاحب کی طرف تو کبھی سائمن بھائی جان اور ان کے بیوی بچوں کی جانب جاتا۔ بمشکل ان منہوں اندازوں سے جان چمڑا کر میں نے دوبارہ غور کیا۔ وہ اداس ضرور لگ رہی تھیں مگر سو گوار نہیں۔ خدا نخواستہ اگر کوئی بری خبر ہوتی تو ان کے چہرے پر اتنا سکون تو نہ ہوتا۔ اداسی ایک الگ احساس ہے اور غم ایک بالکل ہی جدا آفت۔

”اب تم ہی اسے سمجھاؤ“ میرے کہنے پر تو دروازہ نہیں کھول رہی۔ ”اچانک صاعدا نے مجھے مخاطب کیا۔ وہ میز پر ہاتھیں اتر کر بیٹھی آ رہا تھا۔

”کون! مینو؟“ میں نے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کیا ہوا اسے؟ پھر کوئی جھگڑا؟“ عمر کے بارہ تیرہ سال کے فرق کے باوجود دونوں کبھی کبھار بچوں کی طرح لڑتے جھگڑتے بھی تھے اور پھر جب مینو ناراض ہوتی تو صاعدا کو اسے منانے میں دانتوں تلے پیسہ آجاتا پھر بھی وہ یہ معرکہ بڑی خوش دلی سے سر کیا کرتا۔ آج سے پہلے اس نے کبھی میری مدد طلب نہ کی تھی۔

”میری پرویشن ہوگئی ہے۔“ یہ میرے سوال کا جواب نہ تھا۔ اس لیے اتنی غیر متوقع اور اچانک سنائی اس خوشخبری میں اپنا رد عمل ڈھنک سے ظاہر بھی نہ کر سکی۔ پہلے تو چند سیکنڈ تک اسے حیرت سے دیکھتی رہی۔ کیونکہ اتنی اچھی خبر سنانے کا اس کا طریقہ ہی عجیب تھا پھر ذرا سنبھل کر مبارکباد پیش کی۔

”اور مجھے ٹریننگ کے لیے جاپان بھیجا جا رہا ہے۔“ یہ اگلی اطلاع اور بھی ٹانگ تھی ”دوسال کے لیے۔“ اس نے اضافہ کیا اور میں سب سمجھ گئی۔ انگل کی نیکی آنٹی کے آنسو اور مینو کا کمرہ بند کر لینا۔ ڈھیلے اور سست انداز میں میں صوفے پر بیٹھ گئی۔

”صرف دوسال کی تو بات ہے میں بھی سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں اسے مگر وہ بڑھنے پر تیار ہو تب تاں۔“

”تم نے بھی تو اسے اپنے آپ سے حد سے زیادہ اٹنچ کر لیا تھا۔“ آنٹی نے کہا۔ ”اب مجھے کیا پتا تھا کہ.....“ وہ بڑبڑایا اور مجھے لگنے لگے۔ جبکہ مجھے اس وقت کسی سنج کا ہوش نہ تھا۔ وہ دوسال کے لیے یہاں سے جا رہا تھا۔ بہت دور..... میرا دل اٹا ہونا چاہا رہا تھا اس دکھ کو یہی حسوس کرنا چاہ رہا تھا جیسے باقی سب لوگ کر رہے تھے مگر میرے دل کوئی احوال اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ اپنے یا صاعدا کے بارے

میں ہا ہمیشہ سے ہے۔“ انکل کی یہ بات آنٹی کو سوچ میں ڈال گئی۔ وہ کیا سوچ رہی تھیں یہ تو انہوں نے بعد میں بتایا۔ فی الحال وہ بھی مینو کو کمرے سے نکالنے کے جتن میں مصروف ہو گئیں۔ انکل کے کوئی دوست آگے۔ اب لاؤنج میں دونوں ہی تھے۔ میں اب تک اسی کیفیت میں تھی۔ کب سے میرے ہونٹوں سے ایک لفظ تک نہ نکلا تھا۔ بات بیٹھی میں کھوئی کھوئی نظروں سے سامنے والی دیوار کو تک رہی تھی۔ وہ میرے ایک آن بیٹھا۔

”نازد..... پریشان مت ہو۔“ اس نے مجھے تسلی دینا چاہی۔

”آں.....“ میں کسی گھر سے خیال سے چوکی۔

”میں نے کہا‘ پریشان مت ہونا۔“

”پریشان..... آں..... ہاں..... مم..... مگر کیسے..... کیسے پریشان نہ ہوں.....

پریشان تو ہوں گی ناں.....“ اسی کھوئے کھوئے سہرا سہ سے انداز میں نے کہا۔

”پاگل‘ اس میں پریشان ہونے کی کون سی بات ہے۔ تم نے سنا نہیں پایا کیا کہہ

رہے ہیں۔ میں کوئی ہمیشہ کے لیے تو نہیں جا رہا۔ صرف دو سال کی بات ہے اور دو

مال پلک جھپکتے میں گزر جائیں گے۔“

”صرف دو سال؟“ میں نے ”صرف“ پر زور دیتے ہوئے بتایا۔ ”تمہارے

لیہ یہ سرف دو سال ہوں گے۔ مجھ سے پوچھو کہ یہ دو سال مجھ پر کس طرح گزریں

گے۔ وقت کا کیا ہے وہ تو واقعی گزری جا رہا ہے۔ کبھی رکا بھی ہے بھلا؟ مگر یہ تو

اٹارنے والے کو چاہتا ہے کہ وہ وقت کو کس طرح گزرتا ہے۔“ میں نے آہستہ

کہا۔ میرے برعکس وہ بہت رلیکس موڈ میں تھا بلکہ میری بات سن کے اور بھی ہلکا

ساہا..... نے مسکرایا۔

میں سوچتا۔ وہ تو مینو کے بارے میں سوچ سوچ کر ہلکا ہو رہا تھا۔

”کیسے سنبھالوں گی میں اسے۔ کیسے بھلاؤں گی؟ میں تو یہ فن کب کا پھول

چکی۔ یہ فرض تو اب صاعد نے بھنا شروع کر دیا تھا۔“ میں یک دم بے حد پریشان ہو

اٹھی۔ مجھے ایسا لگتا ہے وقت ایک بار پھر پانچ سال پیچھے لوٹ گیا ہو اور مینو پھر سے وہی

ردتی بسورتی بچی بن گئی ہو جس کے آنسو میرے لیے مسلا بن گئے تھے جسے زندگی کی

رونقوں کی چاب لوٹا تا میرے لیے سب سے مشکل گمب سے ضروری کام تھا۔

”پہلے صائم گیا..... پھر صاحب..... اب تم بھی.....“ آنٹی نے نئے سرے سے

رونے کا پروگرام شروع کیا۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو رقیہ خاتون۔ سب اپنے اپنے نصیب کا دانہ ڈھونڈنے

لکھ ہیں اللہ سے خبر کی دعا کر ڈانٹا اللہ لوٹنا تو سب ہی کو ہے اپنے گھر وندے میں۔

صائب کے بھی دو سمسٹر رہ گئے ہیں ایک سال کے اندر اندر وہ تمہارے پاس ہو گا اور

اس کی قابلیت پر تم خود بخود دغیر محسوس کرو گی۔ صاعد بھی خود نہیں جا رہا‘ اس کا رزق اسے

کھینچ رہا ہے۔ لوگ تو رزق کی پکار پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پردیس جا رہے ہیں یہ تو پھر

دو سال کی قلیل مدت کے لیے جا رہا ہے۔“

”ہمارا گھر تو خالی.....“ ان سے بات تک مکمل نہ کی گئی۔

”اللہ نہ کرے خالی کیوں ہو گا۔ نازنین اور زمین بھی تو ہماری ہی بچیاں ہیں

انہیں ہمارے گھر بھیج کے اللہ نے شاید اسی کام اڑا لیا ہے جو تین تین بیٹے دے کر

بھی موجود تھی۔ شاید یہ اسی دن کے لیے ہمارے پاس آئی تھیں کہ جب ہمارے بیٹے۔

اپنے اپنے مقصد کے لیے پردیس نکلیں تو یہ بیٹیاں بن کے ہمارے پاس رہیں ہمارے

اکیلے پن کا مداوا کرنے کے لیے۔ بچیوں سے ہمارا گھر ویسا ہی بھرا بھرا اور آباد لگے گا

”تمہیں کیا پتا صاعد تم میرے لیے کتنی بڑی مشکل کھڑی کر کے جا رہے ہو۔“
آنے والے وقت کے تصور سے ہی میں گھبرا رہی تھی۔ ان گزرنے پانچ سالوں نے
مینیو کی ضد کو اور بھی پختہ کر دیا تھا۔ اپنی مرضی کے خلاف کچھ ہوتا دیکھ کر وہ آپے میں نہیں
رہتی تھی اور اس کی کھنکی جان لیوا ثابت ہوتی تھی میرے لیے۔ میں ضرور کر سکتی تھی کہ
صاعد کے جانے کے بعد اسے پینڈل کرنا میرے لیے آسان ثابت نہیں ہوگا۔ صاعد
کے ضروری اور غیر ضروری الاؤ اور حد سے زیادہ ملی توجہ نے اسے اور بھی ضدی اور ہٹ
دھرم بنا دیا تھا۔ پتا نہیں وہ اس کا جانا کیسے برداشت کرے گی۔ کہیں بیمار نہ پڑ جائے
اور اگر بھوک ہڑتال پر اتر آئی تو۔۔۔ تو کیسے میں۔۔۔“
”تم تو ابھی سے کمزور پڑ رہی ہو تازو۔“ اس کی آواز پر میں اپنے خیالوں سے
باہر آئی۔

”ہاں واقعی کمزور تو میں ہوں اور مجھ پر بہت بڑا بار ڈال رہے ہو۔ اگر دوبارہ
ڈالنا ہی تھا تو اٹھایا کیوں تھا۔“

”کیا مطلب؟“ اس کی مسکراہٹ مدہم ہو گئی۔ اس کی پیشانی پر ایک شکن بھی
نمودار ہوئی۔

”تم نے ایک بار بھی سوچا کہ تمہارے جانے کا سن کر۔۔۔۔۔ اف صاعد تم
کتنے۔۔۔۔۔ میں اسے پتا نہیں کون سا خطاب دینا چاہتی تھی۔ کوئی مناسب لفظ نہ سوچنے
پر جھنجھلا کے چپ کر گئی۔

”سوچا تھا۔۔۔۔۔ مگر پھر خیال آیا تم بھی یہ نہیں چاہو گی کہ میں اتنا اچھا موقع ہاتھ
سے جانے دوں۔ ایسی جاب میں اتنی جلدی ترقی کے ایسے چانسز کم ہی ملتے ہیں اور
پھر صرف دو سال ہی کی تو۔۔۔۔۔ سوریا میں پھر دو سال کو ”صرف“ کہہ گیا۔ آج تو

بار بار اس کی مسکراہٹ پھلتی جا رہی تھی۔ لہجہ ایسے کٹک رہا تھا جیسے اسے کوئی خزانہ مل گیا
۔“

”لیکن مجھے کیا پتا تھا تم اسے اتنا سرسلی لوگی۔ میرے جانے کی خبر تم پر ایسے اثر
کرے گی۔ اب بھی اگر تم کہو تو۔۔۔۔۔“ وہ پتا نہیں کیا کہنے جا رہا تھا۔ میں نے جلدی سے
اس کی بات کاٹ دی۔

”میں اپنی نہیں مینیو کی بات کر رہی ہوں۔ تم نے اس کے بارے میں بالکل بھی
نہیں سوچا۔ یا تو تم اسے اپنے ساتھ اتنا منچنے نہ کرے اور اگر کیا تھا تو اس کا خیال بھی
کرتے۔“

میری بات پر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس کے مسکراتے لب یوں سٹے چسے بھی
صلیے ہی نہ ہوں۔ آنکھیں بے تاثر ہو گئیں۔

”وہ میرے لیے بہت پر اہم کر کی ایٹ کرے گی صاعد۔ وہ اب مجھ سے زیادہ
تمہارے قریب ہے۔ اپنا ہر دکھ درد ہر خوشی تم سے شیئر کرنے کی عادی ہے۔ وہ بہت
بری طرح ڈسٹرب ہو جائے گی، بکھر جائے گی۔“

”میں اسے سمجھا دوں گا“ تم فکر مت کرو۔“ ٹھنڈے لہجے میں کہتا وہاں سے
بہت گیا۔ بعد میں پتا نہیں اس نے کیسے مینیو کو پینڈل کیا کہ وہ کوئی بڑا ہنگامہ کھڑا کرنے
سے باز رہی۔ اگرچہ آنکھیں اس کی اب بھی اباب بھری رہیں۔ بات بات پر چھلک
بھی جاتی مگر اس نے صاعد کو روکنے کی ضد نہ کی۔ دوسری جانب آنٹی نے بھی اپنا وہ
نیال ظاہر کر دیا جو اچانک ان کے دل میں انگلی کی بات سن کر آیا تھا۔

”صاعد کے جانے سے پہلے اس کی اور نازنین کی شادی کروا دیتے ہیں۔
نازنین ویسے بھی اب امتحان دے کر فارغ ہے۔“

”یہ تمہیں اچانک کیا سوچھی؟“ انگل نے پوچھا۔

”اچانک کیسے؟ یہ تو بے شمار حقیقت ہے۔ پڑھائی سے فارغ ہوتے ہی ہمیں نازنین کو باقاعدہ اپنی ہوئی حیثیت تو دینی ہی تھی۔ اگر صاعد نے جانا تب بھی اور اگر اب جا رہا ہے تب بھی۔ جانے کا پروگرام نہ ہوتا تو میں یہ شادی خوب دھوم دھام اور تیاری کے ساتھ کرتی لیکن اب صاعد کے پاس دو ہفتے ہیں تو ہم فی الحال جلدی میں ساوگی کے ساتھ ہی۔“

”نہیں! میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔“ انگل نے ان کی بات پوری نہ ہونے دی۔

”مگر کیوں؟ آپ کو آخر عمر کس بات پر ہے؟“

”اگر صاعد کا جانے کا پروگرام نہ ہوتا تب میں بھی تمہاری طرح اس بچے پر سوچتا لیکن میرے خیال میں ان دونوں کو اس رشتے میں باندھنے کے لیے یہ موقع مناسب نہیں جبکہ صاعد کے جانے میں صرف دو ہفتے رہ گئے ہیں۔ تم کتنی بھی جلدی چنانچہ ایک ہفتے سے پہلے تو شادی کی تقریب نہیں رکھو سکتیں۔ ظاہر ہے پہلی پر سرسوں بٹمانا تو ناممکن ہے۔ صرف ایک ہفتے کے لیے دونوں کو پابند کرنا ٹھیک نہ ہوگا۔ درمیان میں دو طویل سال ہوں گے اور یہ دو سال..... نہیں رقیہ خاتون یہ ہرگز مناسب نہیں ہوگا۔“ انہوں نے اس قطعی انداز میں ان کی جو بزدلی کہ وہ مزاحمت تک نہ کر سکیں۔

اور پھر وہ چلا گیا۔ یہ دو ہفتے مینو نے خود پر بے حد ضبط کرتے ہوئے گزار دیے تھے۔ میں اس کا حوصلہ اور برداشت دیکھ کر حیران تھی۔ یہ وہ چیز تھی جو میں نے اسے نہیں سکھائی تھی۔ یہ وہ وصف تھا جو میرے نظیر کے مطابق فطری ہوتا ہے۔ مجھ میں تھا مگر مینو کو اس سے محروم دیکھ کر میں نے کبھی نہ سوچا کہ اسے بھی اس وصف سے آراستہ

کروں۔ یہ کام بھی یقیناً صاعد کا ہی تھا اور صاعد کے جانے کے بعد مجھے پتا چلا کہ اسے بھی اسے وصف سے آراستہ کروں۔ یہ کام بھی یقیناً صاعد کا ہی تھا اور صاعد کے جانے کے بعد مجھے پتا چلا کہ میں ٹھیک تھی۔ صبر اور برداشت کا مادہ واقعی قدرت کی جانب سے ہی ودیعت ہوتا ہے۔ اگر کسی کے اندر یہ وصف فطری طور پر موجود نہ ہو تو باہر سے وہ کتنا ہی اس کا مظاہرہ کرے بلا خراس کی کمزوری عیاں ہو ہی جاتی ہے۔

صاعد نے کے جانے کے بعد مینو بھی کمزور پڑ گئی۔ وہ اتنی شدید بیماری ہوئی کہ میں تو میں آہنی کے بھی ہاتھ پیر پھول گئے۔ اس کا بخار تھا کہ اترنے کا نام نہ لیتا تھا۔ شکر ہے کہ میں فارغ تھی اور گھر پر ہی ہوتی تھی۔ میں نے اپنا بھرپور وقت اور توجہ اسے دی۔ ہمارے درمیان پھر سے وہ رشتہ استوار ہونے لگا جو صاعد کے درمیان میں آنے سے مزور پڑے لگا تھا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ وہ اب مجھ سے زیادہ اس کے قریب تھی۔ حالانکہ اس نے آنکھ کھلنے ہی ماما پاپا کے بعد جس رستے کو اپنے پاس محسوس کیا تھا وہ میں تھی۔ میں بھی بہن بھائی کو ترسی ہوئی اس ننھے کھلونے میں ایسی لگن ہوئی کہ وہ ماما سے زیادہ مجھ پر انحصار کرنے لگی۔ میں اسکول سے آتی تو ماما بے جا چارگی سے بتاتیں کہ وہ ان کے ہاتھ سے سیریلک کھانے پر تیار نہیں۔ دو سال کی عمر سے ہی اس نے ماما کے بجائے مجھ سے لے کر سونا شروع کر دیا تھا اور پھر جب اسکول میں داخل ہوئی تو کئی بار کلاس سے بھاگ کر میری کلاس میں آ جایا کرتی تھی۔ میں اس کی بہن بھی تھی دوست بھی، آیا بھی، ٹیچر بھی۔ صاعد درمیان میں آیا تو وہ مجھ سے خاصی دور ہو گئی۔ حالانکہ اب بھی مجھے اتنا ہی پیار کرتی تھی۔ اب بھی مجھے پکارا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں اتنی ہی محاسن ہوتی جتنی محاسن زندگی میں اپنا پہلا لفظ ”پیا“ ادا کرتے ہوئے اس کے اندر بھری تھی۔ جب ماما نے اسے مجھے ”ایا“ کہہ کے پکارنا سکھانا چاہا اور اس

صاحب کا ذکر بھی درمیان میں لے آئی۔ دل سے میں بھی اس ذکر کے لیے بے چین ہوتی۔ وہ صاحب کی باتیں کرتی تو میرے اندر رسکون اتارنے لگتا۔ وہ اکثر بیشتر فون کرتا رہتا تھا، پھر مینو کی دلچسپی کمپیوٹر میں بڑھی تو انٹرنیٹ کے ذریعے دونوں کے درمیان پھر سے گہرا رابطہ ہو گیا۔ فون پر چند منٹ بات کرنے سے مینو کی تسلی بھی نہ ہوئی تھی۔ رات دیر تک اس سے گھنٹوں چٹینک کر کے اسے چٹینا لگنے لگا۔ یہ ایک نئی مصروفیت تھی۔ میں کبھی اس کا کمپیوٹر بوز بھی کرتی تو صرف اپنے کسی کام کے لیے۔ نینٹ چٹینک سے مجھے رتی برابر لگاؤ نہ تھا اور فون پر ہمیشہ ہی صاحب مجھے بھی بلواتا۔ اٹکل آئی سامنے ہوتے تو ظاہر ہے مجھے جھجک محسوس ہوتی۔ میں صرف سلام دعا کر کے ریوور مینو تھا دیتی۔ چند ایک بار اکیلے میں بات بھی ہوئی مگر میں اس کے کسی سوال کا جواب ڈھنگ سے نہ دے سکی۔ وہ پوچھتا بھی تو عجیب باتیں۔

”مجھے کتنا یاد کرتی ہو؟“

لو بھلا یہ بھی کوئی سوال ہوا۔ پتا ہوتا وہ یہ سوال کرنے والا ہے تو کہیں سے وہ پتا نہ ڈھونڈ لاتی جس سے یاد کو تویا لانا یا چا سکتا ہے اور پھر پورے حساب کے ساتھ بیٹھ کے اسے یاد کرتی۔

”تم نے بتایا نہیں مجھے کتنا یاد کرتی ہو؟“ وہ اسی سوال پر اٹکا ہوا تھا۔

”مینو سے تو کم ہی۔“ اس سے زیادہ درست اور موزوں جواب مجھے نہ سوچھا جس سے میں اسے بتا سکتی کہ میں اسے کتنا یاد کرتی ہوں۔

”مینو؟“ اس کی آواز میں حیرت کے ساتھ ساتھ غصہ بھی تھا۔

”مینو کے یاد کرنے میں اور تمہارے یاد کرنے میں کچھ تو فرق ہوگا؟“

”کچھ نہیں بلکہ بہت زیادہ۔ یہی تو میں بتا رہی ہوں کہ وہ بہت زیادہ یاد کرتی ہے

کے لبوں سے ”ایپا“ کے بجائے ”پیا“ ادا ہوا تب سے میں اس کا یہاں ہی تو تھی مگر بعد میں شاید اتنی اچھی دوست نہ رہی تھی۔

اب دھیرے دھیرے ہماری دوستی اور ہم آہنگی کے اچھے دھاگے سلینے لگتے تھے۔ میں جانتی تھی کہ زلزلے آنے کے بعد میں ایک بار پھر مصروف ہو جاؤں گی اور باؤس جاب کے کڑے پیر یڈ میں ایک بار پھر مجھے اس پر توجہ مجبوراً کم کرنا پڑے گی اور اس بار میری کمی پوری کرنے کے لیے صاحب مجھے موجود نہ ہوگا۔ اس لیے میں نے شعوری طور پر اسے اس وقت کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔ یوں بھی اب وہ عمر کے اس دور میں داخل ہو رہی تھی کہ میں پیار سے اسے سمجھا سکتی تھی۔ میں نے اسے سکھانے کی کوشش کی کہ کیسے وہ دوسروں پر انحصار کرنے کے بجائے اپنے ہوتے پرسب کچھ کر سکتی ہے۔ اسے دوسری دوسری سرگرمیوں میں دلچسپی لینے پر اکسایا۔ اس کی فرینڈز کے ساتھ ریلیشن شپ ڈیولپ کرنے میں اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اب وہ میری سلیکٹڈ قسم کی دوستوں کے ہاں کبھی کبھی آتا جانا شروع ہو گئی تھی۔ وہ بھی آتی رہتیں۔ اسٹوری بکس پڑھنے کا شوق بھی میرا ہی پیدا کر دیا تھا جس سے وہ اپنا فارغ وقت بغیر کسی کی مدد کے گزار سکتی تھی۔ انڈور گیمز کی جانب اس کا رجحان پیدا کیا۔ سوئمنگ کلاسز جوائن کر لیں۔

اب وہ مجھ سے زیادہ مصروف تھی۔ ایولول کی اسٹیڈیز، ایوننگ ٹیوشن کلاسز۔ کلب میں سوئمنگ کلاسز اور نیشنل ٹینس۔ بے شمار فرینڈز۔ نئی نئی کتابیں پڑھنے کا چمکا اور وہ اس کا پرانا شوق کارٹونز دیکھنا۔ ان سب کے باوجود میں دن میں ایک ڈیڑھ گھنٹا صرف اور صرف اس کے ساتھ گزارنا نہ بھولتی۔ اس کے سارے دن کی روداد سنتی۔ اس کی فرینڈز کے قصے۔ کئی نئی کتاب پڑھتے اور وہ غیرہ اور ہر بار وہ کسی نہ کسی طرح

اور اس کے مقابلے میں تو....." اچانک مجھے احساس ہوا کہ لائن کٹ چکی ہے۔
میں نے خاموشی سے ریور کھ دیا تھا۔

ہاؤس جاب سے فارغ ہو کے بعد میں کچھ عرصہ اس فراغت کے مزے لوٹنا چاہتی تھی۔ مینو بھی اویسولنز کے رزلٹ کے انتظار میں تھی۔ میں نے اپنی میڈیکل کی تعلیم کو کیریئر بنانے اور پریکٹیکل لائف شروع کرنے سے پہلے کچھ عرصہ گھر میں گزارنے کا فیصلہ کیا اور نہ میری اکثر فرینڈز پرائیویٹ اور گورنمنٹ ہسپتالوں میں جاب یا تو تلاش کر رہی تھیں یا شروع کر چکی تھیں۔ میرے اس فیصلے کے پیچھے تین وجوہات تھیں۔ ایک تو مینو دوسری آئی کی خواہش اور تیسری صاعدی متوقع آمد۔

آئی کی کا خیال تھا کہ صاعد کے آتے ہی اب ہماری شادی ہو جانی چاہیے اس کے بعد جو صاعد چاہے بیوی سے نوکری کروانا چاہے تو اس کی مرضی گھر رکھنا چاہے تو اس کی مرضی۔ انہوں نے سب کچھ صاعد کی مرضی پر چھوڑا تھا اور اس کی مرضی میں جانتی تھی۔ اتنا اعتماد تو تھا اس پر کہ وہ میری پسند کو ہی اولیت دے گا۔ انکل کا آئینہ یا تھا کہ مجھے اگر بطور ڈاکٹر اپنا کیریئر اسٹیبلیش کرنا ہے تو جی۔ یہاں وہاں جاب تلاش کر کے خود کو پابند کرنے کے مجھے پاپا والا گھر بیچ کے اپنا کلینک بنالینا چاہیے۔

ان کی بات میرے دل کو لگی تھی۔ واقعی اس طرح میں اپنے پروفیشن اور پرسنل لائف کو بیلنس رکھ سکتی تھی۔ اب بس صاعد کا ہی انتظار تھا۔ صائب تو کوئی ماہ پہلے ہی پاکستان واپس آ چکا تھا۔ اور وہ ایک بے حد سہانی صبح تھی جب نماز کے بعد سلام پھیرتے ہی مجھے مینو کی چپکار سنائی دی۔

”صاعد بھیا آ گئے!“ میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ بے اختیار ہی وہ دعا میرے لبوں پر آ گئی جو پچھلے دو سالوں سے میری نمازوں کا حصہ تھی۔

”یا اللہ صاعد کو یہاں رکھنا اپنی حفاظت اور سلامتی میں رکھنا اور اسے خیریت اور کامیابی کے ساتھ واپس بھیجنا۔“

میں اپنی عادت کے مطابق اس دعا پر خود ہی جھینپ گئی۔ گناہ زید کر کے میں کمرے سے نکلی تو وہ سامنے تھا۔ کارپٹ پر آتی پاتی مار کے بیٹھا ہوا۔ صوفے پر بیٹھی آئی کی گود میں اپنا سر رکھے، انکل کے سوالوں کا جواب دیتا ہوا۔ مینو اس کے برابر نیچے ہی بیٹھی اور آنکھوں میں بے پناہ اشتیاق لیے اسے کتنی جاری تھی۔ کتنا اپنا اپنا تھا یہ منظر! جیسے درمیان میں وہ دو سال کبھی آئے ہی نہ ہوں۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی تو میں نے ایک بار پھر جھینپ کر اپنی نظریں جھکا لیں مبادامیری نگاہوں کی وارننگی وہ محسوس نہ کر لے۔ مجھے مینو پر رشک آیا جو اس قسم کے کسی احساس کے بغیر اسے ایک ملک دیکھے چلی جاری تھی۔ صاعد نے اس کے سر پر چپٹ لگائی۔

”تم کیم مجھے ٹکٹنگی بانوہ کے گھور رہی تھی؟“

”اتنے دنوں بعد جو نظر آئے ہیں۔“ گویا وہ دو سالوں کی کسر آج ہی پورا کرتا چاہتی تھی۔ سب ہنس پڑے۔

”اور ایک بات اور بھی ہے۔“ صائب نے کہا ”اور وہ یہ کہ اب تم واقعی دیکھنے کے قابل چیز بن گئے ہو۔ جاپان گئے تھے سو چاہتا تھا جاپانی گڈے بن کے لوٹو گے مگر یار تمہاری پرستائی کو تو چار چاند لگ گئے۔ یہ نیہیئر اسٹائل بھی خاصا سوٹ کر رہا ہے۔“

”اچھا چلو بس۔“ نظر مرت لگا دیتا۔ ”آئی کی کو وہم نہ گھیر لیا۔ ساری مائیں ایک سی ہوتی ہیں مجھے ماما یاد آئیں۔“

”جناہ تبدیلی تو یہاں آئی ہے۔“ صاعد نے اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی مینو کی سنہری پونی ٹیل بھینچی۔

میں تیرا خالی کمرہ ہوں.....O.....47

”نہیں لیکن ہم سب ابھی تک ڈرتے ہیں اس کی ناراضی سے۔“ صائب نے باور کرایا۔ وہ مسکرا دیا۔

اگلے کئی دن وہ مسلسل حیران ہی ہوتا رہا۔ اس کے خیال میں مینو اب سر سے ہیر تک بدل چکی تھی۔ شکلا صورت ابھی اور عادتاً فطرتاً بھی۔ ابھی اس میں وہ بچپنا بہت حد تک باقی تھا جو اس نے دیکھ رکھا تھا لیکن یہ ایک نئی کچھ کچھ سوشل مینوس کے لیے اجنبی تھی۔ وہ تو اس مینو سے واقف تھا وہ گیلو گول منول بچی جو اسے اس کے سب سے چھٹی چھٹی رہتی۔ انجان لوگوں کا سامنا کرنے سے کتراتے اور نئے دوست بنانے سے گھبراتے تھی جو کھلی سے بے پروا سی تھی اور جو میرے بار بار کہنے پر اپنے بال سنوارنے اور حلیہ درست کرنے پر راضی ہوا کرتی تھی۔

یہ مینو اس کے لیے نئی تھی جو بال نفاست سے باندھتی تھی۔ اپنے لباس کے ساتھ میپنگ ربرینٹ، ٹاپس اور بریسیلیٹ وغیرہ کا باقاعدہ اہتمام کرتی تھی۔ ہفتے میں دو بار کل میں سوئٹنگ اور نیبل ٹینس کے لیے جاتی تھی اور جس کے ڈھیروں دوست تھے جن سے وہ فون پر بھی باتیں کرتی رہتی تھی اور جواب اپنی پیلا پٹو کپڑے کے منہ نہیں بھرتا کرتی تھی۔ البتہ صاعد کے لیے اس کی دیوانگی اب تک ویسی کی ویسی تھی اور صاعد..... وہ مجھے کچھ بدلا بلا لاگ رہا تھا اور سب کے ساتھ تو نہیں البتہ میرے ساتھ اس کا رویہ ناسا اکڑا ہوا تھا۔ میں اندر سے اندر سہم سی گئی۔ کیا یہی وہ خوف تھا جس کے تحت انکل نے اس کی روانگی سے قبل ہماری شادی کی مخالفت کی تھی۔ کیا وہ جانتے تھے یہ دو سال جو وہ کمر سے باہر گزارے گا اس کے خیالات میں تبدیلی پیدا کر دیں گے؟ کیا واقعی اس البیر سے بارے میں خیالات بدل چکے ہیں؟ کہیں وہ کسی اور پسند تو نہیں کرنے لگا؟

”ہماری باری ڈول تو اب سینڈر بلا بن چکی ہے۔ یہ سب سے بڑا سر پرانز ہے۔“ اور واقعی یہ سچ تھا۔ یہ فرق تو ہمیں بھی محسوس ہوتا تھا جو گزشتہ دو سال کے دوران اس میں پیدا ہوا تھا۔ تو صاعد تو اتنے عرصے بعد دیکھ رہا تھا۔ یقیناً یہ اس کے لیے حیران کن ہی ثابت ہوا ہوگا۔

”تمہیں کسی نے کھینچ کر رہا کیا ہے درختوں سے لٹکتی رہی ہو؟“

”کوئی نہیں جی۔“ وہ خود کو موضوع بحث بننے دیکھ کر برامان گئی۔

”بچے بڑے ہوتے ہی ہیں اور مینو بڑھنے کی عمر میں ہے۔“ آئی نے بھی توجہ بہرہ پیش کی۔

”ہاں بچے بڑے ہوتے ہیں مگر عمر کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ کسی طریقے قاعدے سے اس کی طرح تو نہیں کہ پہلے بارہ سال زمین میں دھنسی رہی اور پھر اچانک پھتوں سے نکلنے لگی۔“ وہ اب تک حیران تھا۔

”دراصل بات یہ ہے کہ بڑھ تو یہ پہلے بھی رہی تھی مگر چوڑائی میں۔ جب جسم نے مزید پھیلنے سے انکار کر دیا کہ جس لیس اس سے زیادہ نہیں ورنہ بلاست ہو جاؤں گا تو مجبوراً اس بڑھنے کے عمل نے لمبائی کے رخ اپنا کام شروع کیا۔“ صائب نے انکشاف کیا۔ وہ ناراض ہو کر پیر پختی اوپر چلی گئی۔ پچھلے دو سال میں میں نے اس کی شخصیت پر وہان چڑھانے اور اس کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے جو جو اقدامات کیے تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ اس کا بیزروم الگ کر دیا تھا۔ اب وہ صائم بھائی جان والے کمرے میں رہتی تھی جو میرے کمرے کے بالکل سامنے تھا۔ صاعد کو پتا چلا تو وہ اور بھی حیران ہوا۔

”وہ اکیلے سو جاتی ہے؟ اب اسے ڈر نہیں لگتا؟“

تھی۔ صاعد نے مجھے بھی چلنے کے لیے کہا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی، بھابی بول اُنھیں۔

”یوں کہو ناں کہ ناز میں سے اکیلے میں چار باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے میرے بچوں کو گھمانے پھرانے کا تو بس بہانہ ہی تھا۔“

بظاہر یہ بات انہوں نے مذاق کے ڈھنگ میں کی تھی مگر یہ میں جانتی تھی کہ ان کا مذاق سراسر طعنے ہوتا ہے۔ میں نے تسکین کا بہانہ بنادیا۔

”یہ آپ بھی بس ایک دم پور ہیں۔“ مینو نے اپنی خوب صورت ناک چڑھائی اور صاعد کا بازو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

”اف اللہ! کتنا مزہ آئے گا ناں آج اتنے دنوں بعد ایک بار پھر آپ کے ساتھ جوئے لینڈ جانے میں۔“ بلیک ڈیم پر اسٹاکس میروں کرتے پہنے اور اپنے ہنسی کا لڑ بالوں کی اوچی سی پونی ٹیل بنائے وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی اور لاسٹ سے میک اپ کے ساتھ کچھ بڑی بڑی بھی۔ اگر کوئی آنکھیں بند کر کے سنتا تو یہی لگتا کوئی سات اٹھ سال کی بچی باتیں کر رہی ہے۔ صاعد کے لوٹنے سے گویا اس کا بچپن لوٹ آیا تھا۔

”تم اب بھی بالکل وہی ننھی سی بچی ہو مجھے خواہ غلط بھی ہوئی تھی کہ زمین محمود اب بڑی ہوگئی ہیں۔ بھولوں پر بیٹھنے کے خیال سے ہی کیسے چپکنے لگ گیا ہے۔“ صاعد نے اس کے خوشی سے دکتے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

”اوں ہوں! بھولوں میں بیٹھنے کے خیال سے نہیں! بلکہ بھولوں پر آپ کے ساتھ بیٹھنے کے خیال سے۔“ وہ اب اس کے بازو سے باقاعدہ لنگ رہی تھی۔

”تو یہ یہ لڑکی تو عاشق ہے صاعد کی۔“ انہیں باہر نکلتا دیکھ کے آنٹی نے اپنی سادگی میں کہا۔

یہ سوال مجھے بے چین کرنے لگے۔ میں نے اس پر مزید غور کیا تو مجھے ذرا تسلی ہوئی۔ وہ مجھ سے اجنبیت نہیں برت رہا تھا بلکہ خشکی دکھا رہا تھا۔ ایسا نہیں کہ وہ مجھے اہمیت نہیں دے رہا تھا بلکہ وہ اپنی اہمیت جتنا چاہ رہا تھا۔ میرا دل آپوں آپ ہکا ہو گیا۔

”اوہ تو یہ نیٹ پر چیٹنگ نہ کرنے، فون پر اس کے رومانٹک ڈائلاگز کے ویسے ہی رومانٹک جواب نہ دینے اور لمبے لمبے خوب ناک خطوں کے اتنے ہی لمبے اور اتنے ہی بے باک جواب نہ دینے کی خشکی ہے۔ ہوں تو صاحب نخرے دکھا رہے ہیں۔“ ابھی میں نے اسے منانے کے لیے کسی قسم کی کوشش کرنے کے بارے میں صرف سوچا ہی تھا کہ اسلام آباد سے صائم بھابی جان کی فیلٹی آگئی۔ ہمیشہ کی طرح میں رو دا بہ بھابی سے دیک کے کونے میں ہوگئی۔ وہ صاعد کا سن کر آئے تھے اور ابھی ان لوگوں کا چند دن رکنے کا پروگرام تھا۔

اس دن صاعد سب بچوں کو سند باد لے کر جا رہا تھا۔ سب سے زیادہ ہڈ جوش مینو

”اور صاعد..... کیا وہ بھی؟“

یہ جملہ بلاشبہ اتنا سادہ نہ تھا۔ میں نے ردوابہ بھائی کو دیکھا کہ اس نے دل جلے اور معنی خیز فقرے کا مقصد بھلا کیا ہو سکتا ہے۔ یہ ان کا کہنے کا انداز تھا جو مجھے ٹھنک رہا تھا ورنہ اصل مطلب سمجھ کے بھی میں اس لیے سمجھنے پر تیار نہ تھی کہ مینو اب بھی میری نظروں میں بچی ہی تھی۔ مجھے گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ جن امتزاضات سے میں اپنی ذات کے حوالے سے خوف زدہ رہتی تھی کوئی اس پر بھی ایسا امتزاض کر سکتا ہے۔ میں نے تو یہ چھ سال چھوٹک چھوٹک اس گھر میں گزارے تھے کہ بے شک یہ گھر میرے بتایا کا ہے بے شک میں اس گھر کی ہونے والی بہو ہوں مگر ہوں تو ایک ایسی لڑکی جس کے سر پر نہ ماں ہے نہ باپ اور نہ ہی بڑا بھائی۔ میری ذرا سی لغزش بھی کسی کو انگیٹھانے کا موقع دے سکتی ہے۔ میں سدا اپنے حوالے سے کاشف رہی یہ تو سوچا بھی نہ تھا کہ ردوابہ بھائی مینو جیسی بچی پر بھی بات دھر سکتی ہیں۔

”ہو سکتا ہے ان کی بات کا مطلب کوئی اور ہو۔ سمجھ کا کیا ہے وہ تو طر کر کر کے مستقل ہی ایسا ہو گیا ہے۔“ میں یہ سوچتے ہوئے انہیں دیکھتی چلی گئی۔

”ارے ایسے کیا دیکھ رہی ہوں۔ میں نے بھلا کیا کہہ دیا؟“ وہ فٹ بھولی بن گئیں ”ویسے تم گئی کیوں نہیں؟ کہیں صاعد برائے نامان جا رہے۔“

”نہیں وہ کیوں برا ماننے لگے۔“

”ہاں یہ بھی ہے۔ اسے کوئی خاص پروا لگتی نہیں تمہاری۔“ اب ان کا انداز سراسر ٹوہ لینے والا تھا۔ ”جب دیکھو مینو میں سب کچن رہتا ہے۔“

”مینو کو وہ بچپن سے ہی پیار کرتے ہیں۔ اس میں غی بات کیا ہے۔“ میں نے انہیں صاعد اور مینو کی پرانی وابستگی یاد دلایا کہ ان کے خیالات کا رخ موڑنا چاہا۔

”ہاں بھئی بچپن کی محبت.....“ وہ گویا گنگنا ئیں۔

”مطلب کیا ہے آپ کا؟“ یہ میری برداشت کی حد تھی۔ ورنہ میں ان کی ہر انی سیدی بات نظر انداز کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔

”میرا کیا مطلب ہوتا ہے۔ میرا تو زندگی کا مطلب نہ کوئی غرض۔ ویسے ہی تمہیں اپنی چھوٹی بہن سمجھ کے احساس دلانا چاہ رہی تھی کہ اب مینو بچی نہیں رہی۔ اس طرح صاعد کے گلے کا ہار بنے رہنا کوئی اچھی بات تو نہیں۔ دیکھنے دلاتو کچھ بھی سوچے گا۔“

”یہ دیکھنے والے کی نظر کا اور سوچنے والے کے گندے دماغ کا قصور ہوگا۔“ پہلی بار میں ان سے ذرا تلخی سے بات کر رہی تھی۔

”اس وقت تمہیں میری باتیں بری لگ رہی ہیں مگر کبھی ٹھنڈے دماغ سے سوچنا۔ دیکھو..... میری بیٹی چھ سال کی ہو رہی ہے لیکن اگر اگلے چھ یا آٹھ سال بعد میں اس پر پابندی لگاتی ہوں کہ وہ اپنے کنزرت کے ساتھ جڑ کے نہیں بیٹھ سکتی مالی بابا کی گود میں سیر نہیں کر سکتی اور ساتھ والوں کے لڑکے کے ساتھ لڑکیاں مل سکتی ہیں تو کیا میری یہ سوچ گندی سوچ کہلائے گی۔“ نادان لڑکی بیٹیاں بہت سنبھال کے رکھنے والی چیز ہوتی ہیں۔ اب آنٹی کی تو کوئی بیٹی ہے نہیں وہ یہ نزاکت کیا جائیں۔ میں بیٹی کی ماں ہوں اس لیے کسی دوسرے کی بیٹی کو نقصان پہنچنے دیکھ کے خوف خدا سے لرز کر تمہیں ٹوں کے بغیر رہ نہ سکی۔ تم بے شک اسے میرے دماغ کا فتور کہہ لو یا نظر کا قصور۔ مگر بھی یہ لڑکی ذات کا معاملہ ہے اور وہ بھی دن ماں کی لڑکی۔“ انہوں نے ایک طویل آہ بھری۔

”دن ماں کی لڑکی.....“ یہ الفاظ میرے دل کو کانپنے پر مجبور کر گئے۔ مجھے احساس ہوا کہ میں شاید واقعی ایک ماں کی طرح اس کی پرورش کرنے میں ناکام رہی ہوں۔

میں تیرا خالی کمرہ ہوں.....O.....53

جانب کرائی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیٹھ بیٹھ کر جو اس کا جسم پھول رہا تھا اور کسی قسم کی ایک سرساز نہ ہونے کی وجہ سے قد بڑھنے کا عمل رک گیا تھا یہ مسائل دور ہو گئے۔ ایک سال کے اندر اندر اس کا قد تیزی سے بڑھا۔ خوش خوراک وہ اب بھی تھی اب بھی سارا دن فنگر چپیں، ملک شیک، چاکلیٹس، آئس کریم، ہر دوسٹ وغیرہ چلتے مگر فریجکل ایکٹیو ویز کی وجہ سے یہ خوراک اس کے جسم کا جزو بننے لگی اور صحت مندی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر گلال بن کے دوڑنے لگی۔ سونے لگی اور ٹیبل ٹینس نے اس کے نو خیز جسم کو پُرکشش شیب دے دی تھی۔ دوسری جانب نت نئی دوست بنانے سے وہ اپنی عمر کی لڑکیوں کی طرح خود میں بھی دلچسپی لینا بھی سیکھ گئی۔ مجھے کتنی ہلکی آئی تھی اس دن جب پہلی بار اس نے مجھ سے بیوی پاؤں پار جانے کی فرمائش کی تھی۔

”میں ویسٹنگ کرواؤں گی اور فیس پلچ بھی۔ دیکھیں ناں میری مونچھیں نظر آ رہی ہیں! اس نے اپنے چہرے پر سونے کی طرح پھیلے ہلکے سنہرے روئیں کی جانب اشارہ کیا اور میں اور بھی زور زور سے ہنسنے لگی تھی لیکن اب تو مجھے ہنسی بھی نہیں آ رہی تھی اپنی بے وقوفی پر اور اپنی کم فہمی پر۔ روادب بھالی کبھی کسی فطرت کیوں نہ رکھتی ہوں بات بچے کی بتا گئی تھیں۔ ایسا نہ تھا کہ میں ان کے کہنے پر صاعد اور مینو کی جانب سے چونکی ہوئی تھی اور صاعد کی نیت پر شک کرنے لگی تھی۔ ایسا تو میں مر کے بھی نہ کر پاتی، بھلا صاعد اور مینو کے بارے میں ایسی سوچ..... ناممکن۔ دراصل میں اس بارے میں کانفیس ہو گئی تھی کہ آج مینو کے حوالے سے میری بے پروائی کو بھالی بے نوٹ کیا ہے کل کو کوئی اور بھی کچھ کہہ سکتا تھا۔ مجھے اپنی کوتاہی کا احساس تھا۔ میں نے مینو کی تربیت کرنے میں لاؤ پیار کا ضرورت سے زیادہ ہی خیال رکھا مگر اسے زمانے کی اونچ نیچ سکھانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ حالانکہ اب وہ عمر کے اس نازک دور میں تھی کہ میں

”میں کسی کی نیت پر شک نہیں کر رہی نہ کسی پر الزام لگا رہی ہوں۔ مینو کا بچپنا بھی میرے سامنے ہے اور صاعد کی شرافت بھی لیکن بہتا بہت بے جوان لڑکی اور لڑکے کے کھلے میل ملاپ پر یونہی تو پابندی نہیں لگائی۔ ہم شریعت پر پورا پورا عمل کرنے سے کتراتے ہیں۔ پردے میں نہیں بیٹھا سکتے مگر کوئی حد تو قائم رکھ سکتے ہیں۔ عمر کا فرق معنی نہیں رکھتا۔ بے شک صاعد مینو سے پندرہ سولہ سال بڑا ہے مگر چچا ماموں تو نہیں۔ ہے تو پچھا زاد بھائی،“ وہ میرے خیالات کا رخ اس جانب موڑ گئیں جہاں سے میں چاہے کبھی کئی دن ہٹ نہ سکی۔

میں نے اب مینو کو ایک نئی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا اور میں حیران رہ گئی۔ وہ ایک معصوم سی بچی سے ایک اہل لڑائی کب بنی۔ یہ تو مجھے بتائی نہیں چلا۔ ہاں یہ احساس تھا کہ اب وہ چودہ پندرہ سال کی ہو گئی ہے۔ اس نے قد نکال لیا ہے مگر اتنا دھیان کبھی نہ آیا کہ وہ صرف بڑی نہیں بلکہ جوان بھی ہو گئی ہے۔

دو سال پہلے جب صاعد گیا تھا تو وہ بارہ سال کی تھی مگر اپنے آپ سے بے پروا۔ صرف چاکلیٹس کھانے، آئس کریم کھانے اور لٹل لیٹ کے کارٹوں دیکھنے کی شوقین ایک بچی۔ بہت کہہ سن کے وہ منہ ہاتھ دھوئے کپڑے بدلے اور بال بنانے پر تیاری ہوئی تھی۔ شوق تھا تو بس کھانے پینے اور سونے کا۔ نتیجتاً وزن عمر کے لحاظ سے زیادہ اور قد کم۔ صاعد کے جانے سے کے بعد جو اسے بخار چڑھا تو اترنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ نہ ہنے والے اس بخار نے اسے آدھا کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کی ساری جڑ بلی گھسل گئی تھی۔ ان دنوں اسے دیکھ کے خوف آتا تھا۔ پیلا رنگ اتر ا ہوا چہرہ۔ تیزی سے کم ہوتا وزن اور آنکھوں کے نیچے حلقے، پھر اس کی صحت بحال ہوتے ہی میں نے اس کی دلچسپی غیر انصافی سرگرمیوں خصوصاً فزیکل امپروومینٹ والی گیمز کی

میں تیرا خالی کرہ ہوں.....O.....54

اے اچھا برا سمجھاتی۔ میں نے تجیدگی سے یہ ذمہ داری نبھانے کا بیڑا اٹھالیا۔

”میں تو تم اب دو بیالیا کرو۔“ میری اس فرمائش، تاکید یا مطالبے پر وہ نا سمجھنے کے انداز میں میرا چہرہ دیکھنے لگی۔

”البتہ تو ہوں بیا، جب شکار قریض پہنچتی ہوں تو ضرور لیتی ہوں۔“ اس نے سادگی سے کہا اور بھلا وہ شکار قریض کب پہنچتی تھی۔ ہفتے میں ایک آدھ بار۔

”آج رات ٹائم پر اپنے روم میں جا کے سو جانا۔“ وہ کئی راتوں سے دیر تک لاؤنج میں بیٹھی صاعد اور صائب کے ساتھ بگلیں لگاتی اور وی دیکھی رہتی تھی۔ صائب نیند کا کچا تھا ضرور درمیان میں سے اٹھ کے سونے چلا جاتا ہوگا۔

”وہ کیوں؟ چھٹیاں ہیں میری۔ چند دنوں میں میرا کانٹا اسٹارٹ ہو جائے گا پھر وہی روٹیں لائف وہی دس بجے تک سو جانا صبح ساڑھے چھ بجے جاگنا۔ پلیز بیا کچھ دن تو انجوائے کرنے دیں اور صاعد بھیا کتنے دنوں بعد گھر آئے ہیں۔ ان کے ساتھ باتیں کرنے کا وقت ہی رات کو ملتا ہے۔ دن کو تو کوئی نہ کوئی آیا ہی رہتا ہے یا وہ خود کسی نہ.....“

”تو ایسی کون سی باتیں ہیں جو کسی کے آنے پر نہیں ہو سکتیں اور ضرور آدھی رات تک جاگ کے ہی کرنی ہوتی ہیں۔“ اس کی بحث پر مجھے غصہ آیا تو میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ وہ چپ چاپ میری جانب دیکھتی رہی۔ اس رات صاعد نے اسے آواز دے کے نیچے بلایا تو میں پہلے سے دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔ وہ اپنے کمرے سے نکلی تو سامنے مجھے کڑی نظروں سے دیکھتے پایا۔ بُرے بُرے منہ بناتی وہ زور سے دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی۔

اگلے دن صاعد کا موڈ مجھے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خوشگوار محسوس ہوا۔ عجیب

میں تیرا خالی کرہ ہوں.....O.....55

بات یہ تھی کہ یہ ساری خوشگوار ریت واضح طور پر مینو کے لیے نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہٹس مینو کا منہ پھولا پھولا تھا۔ شاید اس لیے وہ اس پر خاص توجہ دے رہا تھا۔ اپنے ہاتھ سے اس کی پلیٹ بریانی سے بھری اور بعد میں اسی کی پیالی سے اسی کے چمچے سے لہیر کھاتے ہوئے صاعد کی یہ حرکت مجھ سے برداشت نہ ہوئی۔ میں نے آگے بڑھ لہیر کے پیالے سے صاعد کے لیے الگ سے کھیر نکالی اور اس کے آگے رکھی۔ وہ ہانک کر مجھے دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری اور پل بھی میں مدوم ہو گئی۔



”میں جانتا ہوں۔“ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ بھی کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔“

”کیا.....؟“ میں بے اختیار بولی۔

”یہی کہ تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں۔“ اس نے میرے سر پر بم دے مارا۔ فوری طور پر میں اس کے اس بے بنیاد اندازے کی تردید تک کرنے کے قابل نہ رہی۔

”اور یہ کہ میں..... یعنی میں خود کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کے یہ شادی روک دوں۔ تمہاری خواہش پوری کرنے کے لیے سارا الزام اپنے سر پر لے لوں لیکن سوری ناز میں اسے مانیں کہ تم یہاں نہیں کر سکتا۔ مجھ سے شادی کرنے کی تم پابند نہیں ہو۔ اگر نہیں دل مانتا تو بے شک تم کرو مگر میرے کان دھڑے پر رکھ کے بندوبست چلانے کے بجائے خود ہمت کرو۔“

”تم..... تم کیا کہہ رہے ہو صاعد؟ میں ایسا کیوں کروں گی؟“ بہت مشکل سے میں نے خود کو یہ چند الفاظ ادا کرنے کے قابل بنایا۔

”ہاں واقعی، بھلا تم ایسا کیوں کرو گی۔ اس سے تمہارا نیک پروین والا امیج نہیں خراب ہو جائے گا؟ لیکن تم مجھے میرے ماما پاپا کی نظروں میں برا کیوں بنانا چاہتی ہو۔“

”میں ایسا کچھ نہیں چاہتی۔“ میں رو بہ تو پڑی۔ میرے آنسوؤں نے شاید اس کے تئو رکچہ ڈھیلے کیے۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گیا۔

”کیوں کرتی ہو تم ایسا؟“

”میں نے کیا کیا ہے؟“ میں مسلسل روتی رہی۔

گھر میں ہماری شادی کے ہنگامے جاگ گئے۔ میں سخت بوکھلائی بوکھلائی سی پھر رہی تھی کیونکہ شادی کی تاریخ تک رکھ دی گئی تھی اور صاعد کا رویہ اب تک مجھ سے اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ پہلے جو میں نے دل کسلی دے لی تھی کہ یہ صرف اس کی پیار بھری ناراضی ہے اور کچھ نہیں اب وہ تسلی بھی کام نہیں آ رہی تھی۔ وہ مجھ پر ذرہ برابر توجہ نہیں دیتا تھا۔ میں نے اس سے صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

”لیس..... کم ان.....“ میری دھمک کے جواب میں اس کی آواز سنائی دی۔ بے جھجکتی میں اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی غیر موجودگی میں میں روز ہی اس کمرے میں آتی تھی۔ یہاں کی صفائی ستھرائی میں نے اپنے ذمے لے رکھی تھی لیکن اس کی موجودگی میں یہاں آنا پہلا وقت تھا۔ اس لیے میں نزوس تھی اور جو بات کرنے آ رہی تھی اس نے ویسے بھی گھبراہٹ طاری کی ہوئی تھی۔

”وہ..... صاعد مجھے..... مجھے تم سے ایک بات کرنا ہے۔“

”یہی تو سارا ردو تہا ہے تم کچھ کرتی ہی نہیں.....“

اچانک اس کی سنجیدگی غائب ہو گئی اور وہ مسکرانے لگا۔

”اور نہ ہی کچھ کہتی ہو۔ کسی کو ایسا بھی نہیں ہوتا چاہیے کسی سربست راز کی

طرح..... کہ کوئی سرخ شیخ کے مر جائے مگر اندر کی بات کی ہوا نہ لگے۔ اچھا جلو بتاؤ

اب..... کیا کہنے آتی تھیں تم۔“

”وہ میں۔“

”صاعد بھیا“ کیا غضب کی مودی.....“ ابھی میں نے کچھ کہنے کی ہمت باندھی

ہی تھی کہ آندھی طوفان کی طرح مینو اندر داخل ہوئی۔ اس نے دستک دینے کی زحمت

کرنا بھی گوارا نہیں کی تھی۔ بڑے ہی جوش میں وہ ہاتھ میں پکڑی سی ڈی کے بارے

میں کچھ بتانا چاہ رہی تھی کہ مجھے دیکھ کے جہاں کی تہاں رہ گئی۔ شاید اسے میری یہاں

موجودگی کی توقع نہ تھی۔ توقع تو مجھے بھی نہ تھی کہ وہ اس موقع پر یہاں آن دھکے گی۔

شاید وہ میری نظروں میں موجود بلکی سی ناپسندیدگی کو بھانپ گئی جسے چھپانے کی میں

نے اپنی ہی کوشش کی تھی اس لیے واپس مڑنے لگی۔

”اوہ سوری میں سمجھی آپ اکیلے ہوں گے۔ میں پھر آ جاتی ہوں۔“

”ایسی کیا بات ہے جو صرف اکیلے میں..... میرا مطلب ہے کہ میری موجودگی

میں نہیں ہو سکتی۔“ مجھے پتا بھی نہ چلا کہ میرے لیے نہ روادہ بھابی کے تیرا پنا لیلے

تھے۔

”بھی ہوتی ہیں جگر کی یاروں میں ایسی سوطر ح کی باتیں۔“ صاعد اس کے پاس

جا کھڑا ہوا اور اس کے شانے کے گرد بازو پھیل کر تھپتھپے ہوئے کہا۔ میرے اندر ناانوس

ی بے چینی ہونے لگی۔ کیسا احساس تھا؟ کیا یہ حسد تھا؟ اگر ہاں تو یہ احساس مجھے اپنی

بہن کے حوالے سے تو نہیں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ اپنی گزیا سی بہن کے لیے۔ میں نے

خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ واپس جانے پر ابھڑتی تھی اور صاعد بعد اصرار

اسے روک رہا تھا۔ کبھی اس کا ہاتھ سمیٹ کر۔ کبھی کمرے کے گرد بازو ڈال کر۔ میں اچانک

کھڑی ہو گئی۔

”میں چلتی ہوں۔“

”مگر تمہیں تو کوئی بات کرنا تھی۔ کوئی بہت ضروری بات.....“

”اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔“ سر دلچپے میں میں ٹٹکتے ہوئے کہا ”اور شاید

میری بھی نہیں۔“ یہ آخری الفاظ میں نے دل میں ادا کیے۔ میں نے دل میں پکارا وہ

کر لیا کہ آج رات مینو سے صاف صاف بات کروں گی۔ اسے صاعد سے مناسب

فاصلہ برتنے کی کڑی تاکید کروں گی۔ وہ تو بچی ہے ان نزاکتوں کو نہیں سمجھتی، مگر

صاعد..... اس کی جانب سے میرے دل میں کھکا پیدا ہو چکا تھا۔ آخر بندہ بشر ہے

فرشتہ تو نہیں۔ غلطی نہ اس کی ہے اور نہ مینو کی۔ بلکہ مینو کی تو بالکل بھی نہیں۔ میں نے

اس کے ذہن میں ایسی باتیں کبھی پیدا ہی نہیں ہونے دیں۔ وہ تو بچپن سے صاعد کے

قریب ہے اور اب بھی یہ فرق نہیں سمجھ پارہی کہ بچپن کی انسیت اس عمر میں کسی اور کو غلط

جنمی میں مبتلا کر سکتی ہے۔ سارا قصور مجھے ان کی قربت کا لگ رہا تھا جس نے صاعد کے

دیکھنے کے انداز کو بدل ڈالا تھا۔

بہت سوچ بچار کرنے کے بعد میں نے ایسے الفاظ ترتیب دیے جن سے میں

مناسب انداز میں مینو کو باور کرا سکوں کہ اس کا اب صاعد سے یوں بے جھجک اور بے

دھڑک میل ملاپ قطعی درست نہیں۔ دل ہی دل میں ان الفاظ کو دہراتے میں اس کے

کمرے کی جانب گئی۔ ابھی رات کے بارہ ہی بجے تھے اور میں جانتی تھی کہ آج کل وہ

میں تیرا خالی کمرہ ہوں.....O.....60

ایک ڈبرہ بجے سے پہلے سوتی نہیں ہے۔ کمرے سے ٹی وی کی ہلکی آواز بھی آ رہی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر میں نے اپنی ہمت ایک بار پھر تجحیح کی۔ مجھے ڈراس سے نہیں اس کی ناراضی سے لگ رہا تھا۔ خدشہ تھا کہ وہ میری بات کا الٹا مطلب نہ نکال لے۔ آخر کار میں نے بینڈل کو گھمایا اور بے آواز دروازہ کھول کے اندر داخل ہوئی۔ اندر کے منظر نے میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکال کر رکھ دی۔

صاعد اندر موجود تھا۔ رات کے اس پہرہ میں وہ کمرے میں موجود تھا۔ اس کے بیڈ پر بیٹھا ہوا اور مینوس کے سینے سے لگی رو رہی تھی۔ رونے کا اندازہ میں نے اس کی سسکیوں سے لگایا تھا۔ اس کی پشت پر اس کے ہلکے ہنگر پالے بال کھڑے ہوئے تھے جنہیں ایک ہاتھ سے سہلاتے ہوئے اور دوسرا ہاتھ اس کی پشت پر پھیرتے ہوئے صاعد مسلسل کچھ کہہ رہا تھا۔ یعنی یہ ٹی وی کی نہیں بلکہ اس کی باتوں کی آواز تھی۔

”مینو!“ غصے اور صدمے کے مارے میری آواز پھٹ سی گئی۔ مینو بدک کے پیچھے ہٹی۔ شاید وہ میری اونچی آواز سے ڈر گئی تھی اور صاعد میری جگہ داخل ہوئے۔ اس نے سرعت سے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کیے اور چند انچ پیچھے سرک گیا۔ تب بھی میری نظر اس پر جمی رہی تو اس نے اٹھ کر کھڑا ہونے میں دیر نہ لگائی۔ یہ اس کے دل کے چور کو ظاہر کر رہا تھا۔ جبکہ مینو اب تک اپنی جگہ پر جمی بیٹھی تھی۔ اس کے آنسو سرخ ہوتے چہرے پر پھیلے تھے اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

”آؤ تازو تم ہی سمجھاؤ مینو کو رورو کے پاگل ہو رہی ہے۔“ بہت جلدی اس نے اپنے اعصاب پر قابو پا لیا تھا۔

”مینو! میں نے کیا کہا تھا تم سے؟“ اسے اور اس کی بات کو سرانظر انداز کرتے ہوئے میں نے کڑے تیوروں سے مینو سے پوچھا۔

میں تیرا خالی کمرہ ہوں.....O.....61

”وہی تو میں پوچھ رہا تھا اس سے کہ آخر تم نے اسے کیا کہا ہے جو یہ اتنی دل برداشتہ ہو کے رو رہی تھی۔ تم ہی بتاؤ کیا بات ہوئی ہے تمہارے درمیان؟“

”جو بھی ہے تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ میں نے پلٹ کے اس سے سوال کیا۔ ”وہ میری چھوٹی بہن ہے میں جو چاہوں اسے کہوں تم کون ہوتے ہو یہ سوال کرنے والے؟“ میرے انداز پر اس کا چہرہ سرخ ہوا۔

”اور کیا یہ سوال کرنے کے لیے کچھ نامناسب وقت نہیں ہے؟“ میرے ایک اور چہرے سے ہونے والے چہرے کی اس سرخوشی کو سفیدی میں بدل ڈالا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ مڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

”مینو میں نے اس دن تمہیں سختی سے تاکید کی تھی کہ صاعد سے دور رہو۔“

”مگر کس لیے؟“ وہ منمنائی۔

”تم جی نہیں ہو جو تمہیں تفصیل سے بتانا پڑے۔ کیا تمہیں احساس نہیں کہ رات کے اس وقت اکیلے میں صاعد کا تمہارے کمرے میں موجود ہونا لوگوں کو کتنی باتیں بنانے کا موقع دے سکتا ہے۔“

”وہ آج پہلی بار تو نہیں آئے۔ ہمیشہ آتے رہے ہیں۔ پہلے تو مجھے سلاتے بھی وہی تھے جب آپ رات وری تک اسٹڈی میں رہا کرتی تھیں اپنے ہپیوڑ کی تیاری کے لیے۔“

”پہلی بات اور اتھی مینو..... اب.....“ میں زچ ہو گئی۔ کیونکہ وہ نئے سرے سے رونا شروع کر چکی تھی۔ ”رو کیوں رہی ہو؟“

”آپ کی وجہ سے۔ آج کل آپ بلاوجہ مجھے ڈانٹتی اور ٹوکتی رہتی ہیں۔ تنگ آ چکی ہیں آپ مجھ سے۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہوں؟“

”ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔“ اس کے آنسوؤں میں کچھ اور روانی پیدا ہوئی۔

”شادی کے بعد نئی زندگی شروع ہوتی ہے اور پرانی دسے داریوں سے چھوٹ ل جاتی ہے مگر میری دسے داری سے تو آپ شادی کے بعد بھی آزار نہیں ہو پائیں گی بیا۔ میں آپ کے اوپر ایک مستقل بوجھ ہوں۔ آپ چاہتی ہیں کہ میں صاعد بھیا سے دور رہوں۔ اسی لیے ناں کہ اب آپ کی ان سے شادی ہونے والی ہے۔ اب وہ میرے بہنوئی بن جائیں گے اور آپ نہیں چاہتی ہیں کہ جس طرح آپ مجھ سے تنگ آنے لگی ہیں وہ بھی مجھ سے تنگ آ جائیں۔“

”اوہ خدایا۔“ میں سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔ میری بات کا اس نے حسب توقع الٹا ہی مطلب نکالا تھا مگر وہ نہیں جو میں خیال کر رہی تھی۔ وہ میرے بارے میں اس قدر بدگمانیاں پالنے لگی تھی کہ مجھے اندازہ نہ تھا۔ بمشکل اس کے سامنے اپنی پوزیشن کلیئر کر کے میں کمرے سے نکلی۔ پتا نہیں اس نے اپنا دل صاف کیا یا نہیں مگر بعد میں میں رات دیر تک سوچتی رہی کہ صاعد واقعی مینو کے لیے اب بھی اتنا ہی بے ضرر ہے جتنا پہلے تھا یا وہ اس کی معصومیت سے کھیل رہا ہے۔ مینو کی سادگی پر مجھے ترس آنے لگا تھا۔ اب میں نے ارادہ کر لیا کہ اس کو سمجھانے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے مجھے صاعد پر نظر رکھنا ہوگی۔ ایسا کرتے ہوئے میری اتانے بلایا کے مجھے ٹوکا۔

”یہ تم کیا کر رہی ہو نا زنین محمود..... ایک ایسا شخص جس کی ذات پر اب تمہارا اعتماد ڈلگنے لگا ہے جس سے تمہیں اپنی بہن کے لیے خطرہ محسوس ہونے لگا ہے اس سے شادی کرنے جاری ہو؟ اور ساتھ ساتھ اس کی چوکی کر رہی ہو؟ یہ کیسی دہری زندگی جی رہی ہو کس عذاب میں خود کو ڈالنے جاری ہو؟ کیا زندگی بھر تم یونہی اعتبار

اور بے اعتباری کے درمیان معلق رہو گی؟“ میری مجبوریوں نے میری انا کو زخمی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔

”تمہیں پتا ہے ناں میں جس گھر میں رہی رہی ہوں وہ میرا گھر نہیں ہے۔ یہ ان کا گھر ہے جو مجھے اس رشتے میں باغ ہٹنے کا مکمل اختیار رکھتے ہیں۔ ان سے یہ اختیار لے کر میں اس گھر میں دوبارہ سر اٹھا کے کیسے رہ پاؤں گی۔ میں جانتی ہوں کہ اس شادی سے انکار کے بعد اٹکل آگئی مجھے گھر سے تو نہ نکال دیں گے لیکن کیا میں اتنے اشتقاق سے رہ پاؤں گی اور کیا مینو کو رکھ پاؤں گی؟ میں تو اسے لے کر یہاں سے نکل بھی نہیں سکتی کہاں جاؤں گی بھلا؟ یہ شادی تو مجھے کرنا ہوگی اپنے قدم مضبوط کرنے کے لیے میرے قدم مضبوط ہوں گے اس گھر میں تو مینو کے پیروں کے نیچے زمین اور سر پر چھت بھی قائم رہے گی اور شادی سے انکار کروں بھی تو کیا کہہ کر؟ کیا میرے پاس ثبوت ہے صاعد کی بے وفائی کا؟ کیا اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ مجھے اس کی نظریں اور نسبت بدلی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور اس میں مینو کے نام پر بھی تو حرف آئے گا۔ عقل مندی اور مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ میں دل پر جبر کر کے یہ شادی ہونے دوں۔ اس شخص کے ساتھ جس کے بارے میں مجھے یونہی سی غلطی نہیں ہو گئی تھی کہ میں اس سے محبت کرنے لگی ہوں اور وہ شخص جس پر اب مجھے رتی برابر اعتبار نہیں رہا۔ ہو سکتا ہے شادی کے بعد حالات خود بخود مستحیل جائیں مینو سے ایک واضح رشتہ قائم ہونے کے بعد وہ خود کو پابند کر لے۔ اس امید کے سہارے میں بغیر کسی پس و پیش کے مایوں بیٹھ گئی۔ مینو کا رویہ اب تبدیل ہو گیا تھا۔ اس نے میری بات پر یقین کر لیا تھا اور اب پورے شوق اور لگن کے ساتھ تیار یوں میں مصروف تھی لیکن صاعد نے اس دن کے بعد سے مایوں والی شام تک یعنی چھ دنوں تک مجھے ایک بار بھی مخاطب نہیں کیا تھا۔ ایک

آدھ بار ہمارا سامنا بھی ہوا تو وہ نظریں پھیر کے چلا گیا۔ اس کی سرسری سی آنکھیں نظر میں شرمساری کی ایک جھلک بھی نہ تھی۔ ”الٹا ایک بھگیا بیگیا سلگتا ہوا سا گلہ تھا۔“

میرے دل کو کچھ ہونے لگا ”کہیں میں ہی تو غلط نہیں؟ کہیں رو دا یہ بھابی کی باتوں کے زیر اثر میرا دیکھنے کا نظریہ ہی تو خراب نہیں؟“ میں نے اپنا محاسبہ کرنا چاہا۔

”صاعد بھیا آپ سے خفا ہیں۔“ اس رات مینو نے بہت ڈرتے ڈرتے مجھے سے سرگوشی کی۔ میری خاموشی نے اس کی ہمت بندھا لی۔

”میں نہیں جانتی آپ میں جھگڑا کس بات پر ہے لیکن بیا اگر آپ کہیں تو میں آپ کی صلح کرادوں؟“

وہ معصوم اب تک نہ جانتی تھی کہ ہمارے درمیان ان بن کی وجہ وہ خود ہے۔ میں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں بھر لیا۔ پیلے گونے والے چہرے کے سوٹ میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

”نہیں ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔“ میں نے یقین دلانا چاہا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیر گئی۔

”کیا ہوا؟ اچھا بابا مانلوں گی تمہارے صاعد بھیا کو اب خوش۔“

جس شام کو میں مایوں بیٹھی اسی رات بھابی کی بہن کا ویرہ تھا۔ صائم بھابی جان اور بھابی تو پچھلے چار دن سے وہیں رہ رہے تھے۔ آج مایوں کی سادہ سی تقریب میں شرک کرنے کے لیے چند گھنٹے کے لیے آئے تھے۔ کل شادی کا فنکشن تو ہم سب نے اٹینڈ کیا تھا لیکن آج ویسے کے لیے صرف انکل اور آنتی گئے تھے۔ صائب انہیں ڈراپ کرنے گیا تھا۔ میں نے موقع صحیح جانا اور اپنے بڑے سے پیلے دوپٹے کو سنبھال لی کمرے سے نکلی۔ مینو کے کمرے کی لائٹس آن تھیں۔ میں نے دبے پاؤں سیڑھیاں

اترنا چاہا مگر میرا پاؤں کسی پائپ میں انک گیا اور میں گرتے گرتے بچی۔ نیچے سے گھر کی ملازمہ مذاہنیاں بھاگی آئی۔

”یہ گیس کے پائپ کیوں پھیلے ہوئے ہیں؟“

”وہ جی صاحب صبح کہہ رہے تھے گیز ریمبی بند کر دوں اور سارے کمرے سے ہیٹر بھی لگے گیس کے کنکشن بھی واپس کھینچ لوں۔ اب گرمی ہو گئی ہے۔ دو ہفتے ہو گئے ہیں کسی نے ہیٹر نہیں لگایا۔“

”تو راستے میں کیوں پھیل کر رکھ دیئے؟“

”یگیگ صاحب نے منع کر دیا کہ ابھی مارچ چل رہا ہے۔ موسم کا کچھ پتا نہیں ایک بارش ہوئی تو ٹھنڈ لوٹ آئے گی۔ شادی والا گھر ہے، مہمان آ جا رہے ہیں گرم پانی ضرورت بھی پڑے گی اور ہیٹر کی بھی۔ اس لیے جی کام وہیں چھوڑنا پڑا۔ اب ذرا فارغ ہو کے دوبارہ فٹ کرنے لگی تھی کہ نیچے سے ماسی جی نے آواز دی کہ میں ان کے لیے چائے بنا دوں۔“ ماسی جی انکل اور پاپا کی بڑی خالہ تھیں۔ ہمارے خاندان کی واحد بزرگ۔ وہ اور چند بزرگ رشتے داروں کو اکثر لما شادی سے چند دن پہلے گھر بلا لیا کرتا تھا اور وہ نیچے والے بڑے کمرے میں ٹھہرے تھے۔

”تم یہ پھیلا داسیو میں اپنے لیے چائے بنانا جا رہی ہوں ان کے لیے بھی بنا لوں گی۔“ اس سہانے میں نے اسے اوپر روکے رکھا تاکہ اس کے علم میں میری صاعد سے ملاقات نہ آ سکے۔ باقی مہمان کمرے میں تھے۔ میں پھیلے کچن گئی برز جلا کے چائے کا پانی رکھا اور پھر ادھر ادھر دیکھتی صاعد کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

پتا نہیں کیا صبح تھا کیا چھوٹ۔ کسی واضح ثبوت کے بغیر میں صاعد پر شک کرتے ہوئے اپنے اور اس کے رشتے میں دارز نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ نہ ہی اس بدگمانی کے

ساتھ زندگی کے اس نئے موڑ میں داخل ہونا چاہتی تھی۔ میں نے اس سے سوری کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تا کہ وہ دل و ذہن ہلکا پھلکا کر کے مجھے اپنی ہم سفری میں لے اور اس میں بھلاکتا و گھٹاتا۔

لیکن آسمان سے زمین پر آنے میں مجھے بس اتنا ہی وقت لگا جتنا یہ دروازہ کھولنے میں لگا۔ ایک بار پھر میں نے مینو کو صاعد کی بانہوں میں دیکھا۔ اس بار وہ رد نہیں رہی تھی مگر اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بھاگ کے مجھ سے لپٹ گئی۔

”پیا..... پیا..... میں.....“ دہشت نے اس کے الفاظ گم کر دیئے تھے اس کا سارا جسم چڑیا کے بچے کی طرح ہولے ہولے لپکپکا رہا تھا۔ میں نے اس کے لرزے ہیکے وجود کو اپنی بانوں میں بھر لیا اور قہر بھری نظروں سے صاعد کو دیکھا۔ وہ جگمگا کھڑا تھا۔ شاید اسے ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ میں..... یوں کی دہن اپنے کمرے سے نکل کر اس کمرے میں آؤں گی جہاں عام حالات میں بھی آنے سے اجتناب رہتی ہوں۔

”تم کس قدر گھٹیا شخص ہو صاعد۔“ میں نے لہجے میں حد درجہ نفرت بھر کے اسے مخاطب کیا ”ایک بچی کی معصومیت سے کھلیئے اس کی بے ضروری محبت کا غلط فائدہ اٹھاتے تمہیں شرم نہیں آتی۔“

”میں نے ایسا کچھ نہیں کیا تاؤ..... میں..... میں تو صرف.....“

”پیا..... وہ..... وہ تو.....“ مینو نے کہنا چاہا مگر میں نے بولنے کا موقع نہ دیا۔

”تم چپ رہو مینو۔ اسی دن کے لیے میں اس سے دور رہنے کی نصیحت کرتی تھی تمہیں۔ یہ ہے اس شخص کا اصل چہرہ گھٹاناؤ اور کروہ چہرہ۔ جسے ندرشتوں کی شرم ہے

نہ خدا کا خوف۔ جو تبتم لڑکی تمہارے گھر میں پناہ کے لیے موجود ہے اسی پر بُری نظر.....“ صاعد کے زوردار چھلنے نے میری بات مکمل نہ ہونے دی۔

”بندر کو اپنی بکواس ارشٹوں کی شرم تمہارے اندر ختم ہوگئی۔ اسی لیے میرے اور مینو کے تعلق پر ایسا کندہ الزام لگا رہی ہو۔ مجھے تو یہ سوچ سوچ کر افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے کبھی تمہیں چاہا تھا، جنہیں سب سے الگ سب سے محترم جانتا تھا۔ آج تم نے صرف اپنے آپ کو آپ نہیں بلکہ مجھے بھی میری نظروں میں گرا دیا ہے۔“

”تو کیا یہ سب جو میں نے دیکھا وہ جھوٹ تھا؟“ میں چیختی۔

”جو تم نے دیکھا وہ سچ تھا مگر جو تم نے سمجھا وہ غلط ہے۔ مینو پریشان تھی میں تو صرف اسے دلاسا دے رہا تھا۔ کیا اپنے ہاتھوں پال کر بڑی کی ہوئی بچی پر میرا اتنا بھی حق نہیں۔ گندگی تمہارے دماغ میں بھری ہوئی ہے۔ تمہاری سوچ میں.....“ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا جو اسے سچا ثابت کر رہا تھا۔ ایک بار پھر مجھے اپنی جلد بازی پر افسوس اور جذب باتیت پر غصہ آیا۔ میں کچھ سنوارنے آئی تھی اور لگاڑ کے جاری تھی۔

”دراصل صاعد..... میں..... مجھے لگا.....“ میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے بولنے سے روک دیا۔ اپنے عقب سے مجھے اب تک مینو کی دہلی دہلی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

”تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے تاؤ، بہت زیادہ مایوس۔ مجھے سوچنا پڑے گا کہ کیا اب میں عمر بھر تمہارا ساتھ رہاؤں گا یا نہیں؟ کسی ایسے انسان کے ساتھ زندگی گزارنا آسان تو نہیں جو آپ کے سب سے پاکیزہ جذبے کو گالی دے۔ میں نے مینو کو کبھی تمہاری بہن کی حیثیت سے نہیں دیکھا، میں نے اسے اپنی بہن اپنی بیٹی کی حیثیت سے.....“ اچانک اس نے کہتے کہتے سامنے دیکھا۔

”کو مینو.....“ اس کی آواز پر میں ہلٹی۔ مینو بے تحاشہ روتی ہوئی باہر کو نکلی تھی اور اب سبز حیاں تیز تیز پھلانگی جا رہی تھی۔

”میری تو چھوڑو اس معصوم کو چرے کے لگاتے ہوئے بھی تمہیں ترس نہیں آیا۔“
”مجھے معاف.....“

”معافی مانگتی ہے تو مینو سے مانگو نازو۔ کیونکہ وہاں سے تمہیں معافی ملنے کی امید بھی ہے لیکن میں..... شاید اتنا ظرف نہ دکھلا پاؤں۔“ میں ہارے قدموں کے ساتھ نکلی اور کچن میں جا کے بیٹھ گئی۔ کتنی ہی دیر تک بیٹھی روتی رہی۔ خود کو مینو کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرتی رہی۔ رورو کے جب آنسو خشک ہو گئے تو ہمت کر کے اٹھی۔
”اب جو بھی ہے معافی تو مجھے مانگنا ہی ہوگی۔“ میں اوپر جانے لگی۔ یہ جانے بغیر کہ میں نے یہ قدم اٹھانے میں بہت دیر کر دی تھی۔

وہ میری معافی..... میری معذرت..... ہر چیز سے بہت دور جا چکی تھی۔



وہ آئی اور اپنے آنسو روکے چلی گئی۔ میرے ماحول میں کچھ اور اداسیاں بو گئی ہیں۔ اس کے نوئے اس کی سسکیاں سب ابھی تک میرے درود پوار پر لرز رہے ہیں۔
ذرا غور سے سنو۔ یہ نازنین کی سسکیاں ہیں۔

”تم کیوں چلی گئیں مینو..... کیوں؟ مجھے ایک موقع تو دیتیں۔ مجھے معافی تو مانگنے دیتیں۔ میں تمہارے پیر چھو لیتی۔ میں جانتی ہوں تم مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ ایک بار معافی مانگنے پر ہی کھلے دل سے مجھے معاف کر دیتیں مگر وہ ایک معافی..... اس کا موقع تو دیتیں۔ بہت جلدی کی تم نے جانے میں..... مگر سوچتی ہوں تمہارا کیا تصور۔ تمہاری جگہ میں ہوتی تو یہی کرتی۔ جہاں سے ہمیشہ پیارا اور مان مینا ہو اسی ذات سے بے اعتبار کا الزام ملے، ہیں سے کچھ اچھالی جائے تو سوائے مرنے کے اور کیا کیا جاسکتا ہے۔ تم بھی مر گئیں۔“

70.....O.....میں تیرا خالی کمرہ ہوں

”نہیں..... نہیں مینو تم مری نہیں۔ تم ماری گئی ہو۔ قتل ہوا ہے تمہارا اور تمہاری قاتل ہوں میں۔“

”میں..... نازنین محمود تمہاری بڑی بہن۔ جس نے تمہاری ماں کی جگہ لینا چاہی تھی لیکن میں نہ تمہاری ماں بن سکی نہ بہن۔ میں تمہاری موت بن گئی اور وہ بھی اتنی وردناک۔ کتنا درد ہوگا تمہارے دل میں مرتے وقت۔ کتنے آنسو بہائے تھے تم نے اور نہ جانے کتنے آنسو تمہارے اندر ہی سسلگتے رہ گئے ہوں گے۔ غلطی میری اور سزا تمہیں بگلتا پڑی۔“

”ہے کوئی جو مجھے سزا دے میرے جرم کی سزا۔ اس قتل کی سزا جو میں نے کیا۔ اپنی مینو کا قتل۔“

وہ بیہوشی انصاف مانگ رہی تھی۔ اپنے لیے سزا طلب کر رہی تھی۔ میں سزا دے سکتا ہوں۔ یہ عدالت میں نے اسی لیے تو لگائی ہے مگر پہلے جرم ثابت تو ہو۔ اس کا قاتل ہونا ثابت تو ہو۔ ابھی اور بھی ہے کوئی جسے اس کٹہرے میں آنا ہے۔ فی الحال تو میں ایک بار پھر خالی ہوں۔

خالی..... تنہا..... اکیلا..... یا پھر وہ مانوس ی خوشبو جو شاید ان نیکوں سے آ رہی ہے جن پر اس کے بال کھرا کرتے تھے۔ شاید یہ خوشبو اس کبل سے آ رہی ہے جسے وہ اودھا کرتی تھی یا شاید الماری میں اب تک لٹکے ان کپڑوں سے جن کو وہ پہنا کرتی تھی۔ ہاں شاید۔

تیری گلے میں سارا دن

دکھ کے نکل کر چھتا ہوں

تیرے سوا مجھے پہنے کون

71.....O.....میں تیرا خالی کمرہ ہوں

میں تیرے تن کا کپڑا ہوں

میرا دیا جلانے کون

میں تیرا خالی کمرہ ہوں

میرا خالی پن اب مجھے کاٹنے لگا ہے۔ کوئی تو آئے یہاں کوئی تو.....

کوئی ہے؟

صاحب حاضر ہو.....



میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”نہیں جی وہ تو دوپہر سے بیچے ہی نہیں اتریں۔“

”دوپہر سے اوپر کیا کر رہی ہے؟“

”پتا نہیں جی۔ وہ اصل میں مینو..... مینو بے بی کے کمرے میں گئی تھیں۔“

”صفائی وغیرہ کرنے لگی ہوگی۔“ میں نے اس سے زیادہ اپنے دل کی تسلی کے

لیے جواب دیا۔ وہ اوپر تھی مینو کے کمرے میں..... یہ جان کے میرے دل میں کھد بدی ہونے لگی تھی۔

”نہیں جی صفائی کرنے تو وہ مجھے ساتھ لے کے جاتی ہیں۔ آپ کو تو پتا ہی ہے

اوپر اب وہ اکیلے جانے سے گھبراتی ہیں اور صفائی تو کل ہوئی تھی۔ بند کمرے میں روز

کون صفائی کرتا ہے۔ میرا خیال ہے وہ اوپر جا کے سو گئی ہوں گی۔ میں کھانے کے لیے

بلانے گئی تو دروازہ بند تھا آواز دینے پر بھی نہیں کھولا۔“ اس کی اطلاع پر میں گلاس میز

پر پہنچ کے اٹھا اور مجھے تیرے اوپر کی جانب بھاگا۔

مینو کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ چند سیکنڈ کے لیے تو میں وہاں کسی پتھر کی طرح

خاموش گزار رہا۔ ایک نامعلوم سی ظلم مجھے گھیرنے لگی۔ آج کتنے دنوں بعد میں اس

دروازے کے سامنے تھا۔ میرا ہاتھ کپکپاتا ہوا آگے بڑھا اور چنڈل پر رک گیا۔ دروازہ

اندر سے لاک نہیں تھا۔ میں نے ایک گہری سانس بھری اور دروازہ بے آواز کھول کے

اندر داخل ہوا۔ شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ اس لیے کمرے میں کوئی لائٹ

آن نہ ہونے کی وجہ سے اندر اچھا ہوا تھا۔ صرف اس کو نے سے ہلکی سی روشنی ٹھیل

رہی تھی جہاں مینو کی رائٹنگ ٹیبل پڑی تھی۔ نازنین اسی ٹیبل پر اپنا سر رکھے بیٹھی تھی اور

یہ روشنی اس خوب صورت ٹیبل لیپ سے پھوٹ رہی تھی جو میں نے ہی اسے اس کی

”شنو ایک گلاس ٹھنڈا پانی لاؤ۔“

آج گرمی بھی حد سے زیادہ تھی اوپر سے راستے میں آدھے گھنٹے تک ٹریفک

بلاک رہی، گاڑی کا بے سی بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ میرا شرخاں ہو گیا تھا۔ گھر آتے

ہی میں ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرتے ہوئے صوفے پر گر گیا۔ لاؤنج کا بے سی آن تھا۔

اپنے بیڈروم میں جانے کے بجائے میں وہیں شو اتار کے نیم دراز ہو گیا اور شنو سے

پانی لانے کو کہا۔

”جوس لے آؤں جی..... یا شر بتایا ہوا ہے بی بی نے وہ لے آؤں؟“

”نہیں“ صرف سادہ پانی۔“ مجھے آئے پانچ منٹ ہو رہے تھے مگر ابھی تک

نازنین کی جھلک نہیں دیکھی تھی۔ ورنہ روز وہ میری واپسی کے وقت یہیں لاؤنج میں

بیٹھی ہوتی تھی۔

”تمہاری بی بی ہیں کہاں؟ کیا کچن میں؟“ اس سے پانی کا گلاس تھاتے ہوئے

برتھ ڈے پہ گفٹ کیا تھا اور جسے اس وقت نازو آن اور آف کرنے کے کھیل میں لگتی تھی۔

”نازو!“ میری آواز پہ بھی اس میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ اس کے ہاتھ اب بھی مٹن پر دے اسے آن اور آف کر رہے تھے اور نگاہیں بدستور دیوار پر لگی درجن بھر تصویروں پہ جمی تھیں۔ وہ تصویریں جو لپکے کے آن ہوتے ہی لے لے بھر کے لیے روشنی میں نہا جاتیں اور آف ہوتے ہی ایک بار پھر تاریکی میں گم ہو جاتیں۔ مجھے ایسے لگا جیسے نازین مینو کے ساتھ آنکھ چولی کھیل رہی ہو۔ ایک بل میں وہ مسکراتی ہوئی اس کے سامنے آ جاتی ہو اور اگلے ہی بل پھر سے چھپ جاتی ہو۔

”نازو! کیا کر رہی ہو؟“ میں نے قریب جا کے اسے دیکھنا چاہا۔ اس کی آنکھیں پلک چمکے بغیر تصویروں پہ ساکت تھیں اور انہیں دیکھ کر بے آسانی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ روتی رہی ہے۔ میرے اندازہ آسو گرتے ہوئے محسوس ہوئے۔

”کیا کر رہی ہوں یہاں؟“ شہو تیار ہی تھی صبح سے ادھر ہی بیٹھی ہو، کھانا بھی نہیں کھایا۔“ میرا ہاتھ خود بخود ہی اس کے کھمرے بالوں پہ چلا گیا۔ اس کے روئے کھمرے بال پیار سے سیٹھ کے اس کے چہرے سے پرے کرتے ہوئے میں نے پوچھا تھا۔ یہ بے ساختگی بھی عرصے بعد ہی سرزد ہوئی تھی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اس حرکت پہ پھیری بھی نہیں تھی ورنہ میری تو صرف موجودگی بھی اسے اب سیٹھ کر دیا کرتی تھی۔

”میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں نازو!“ اب کے میری آواز ڈراما بلند ہوئی ”کیا کرنے آئی تھیں تم؟ کیوں رو رہی ہو؟ چلو..... اٹھو۔ چلو میرے ساتھ نیچے۔“ میں اسے بازو سے پکڑ کے اٹھانے لگا مگر وہ ہلے پہ آماہ نہ تھی۔

”وہ..... وہ مجھے جانے نہیں دیتی۔ یہاں سے اٹھنے نہیں دے رہی۔“

اس کی آواز میں بے چارگی تھی۔ میرا دل بھرا آیا۔

”کون..... کون نہیں جانے دے رہی تھیں؟“ میں نے سرگوشی کی تھی۔

”میںو.....“ جو بابا اس کی سرگوشی سنائی دی۔ میں نے گردن گھما کے اس نیم تاریک کمرے میں اس وجود کو تلاش چاہا جس کا نام نازین لے رہی تھی۔ وہ کہیں نہیں تھی۔ نہ اس کمرے میں نہ اس دنیا میں۔ اس کے باوجود مجھے اس کی موجودگی کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ وحشت میرے اوپر راج کرنے لگی۔

”اٹھو نازو!“ میں دوبارہ اسے یہاں سے لے جانے کی کوشش کرنے لگا مگر وہ دونوں بازوؤں میں اپنا چہرہ چھپا کے رونے لگی۔ اس کی سکیاں اس کمرے کے سوا گوار ماحول کو اور بھی بو جھل کر رہی تھیں۔ آخر میں نے ساری لائٹیں آن کیں تو وحشت میں کچھ کمی ہوئی۔

”میں نے بھی آج لچ نہیں کیا۔“ میں نے اسے بتایا اور وہ رکھائی سے ”تو پھر میں کیا کروں“ کہنے کے بجائے چپ چاپ مجھے تنکے لگی۔ میرا حوصلہ کچھ بڑھا۔

”تم نے بھی نہیں کیا۔ آؤ! آکٹھی پہ ڈر کر لیتے ہیں۔“

”میں نہیں جاؤں گی۔ وہ مجھے نہیں جانے دے گی۔“ وہ خود کھای کے انداز میں کہتی کہیں سے بھی نابل نہیں لگ رہی تھی۔

”آج اس نے کتنے دنوں بعد مجھے پکارتا تھا۔ مجھے آواز دی تھی۔ میںو نے.....“

میں نے خود سنا..... پیا..... پیا..... ہر طرف سے آواز آ رہی تھی۔ میں یہاں خود نہیں آئی سماعہ مجھے مینو نے بلایا تھا۔ اب وہ کہے گی تو میں جاؤں گی۔“

میرا دل کٹنے لگا۔ پتا نہیں کیا ہو گیا تھا اسے۔ ورنہ وہ اتنے کمزور اعصاب کی مالک بھی نہ تھی۔ مینو کی موت نے اسے توڑ کے ضرور رکھ دیا تھا مگر وہ کبھی بھی مجھے ایسی

بکھری ہوئی محسوس نہیں ہوئی تھی جیسی آج لگ رہی تھی۔ اس وقت تو وہ اپنے حواسوں میں ہی نہیں تھی۔

”ٹھیک ہے مت جاؤ نیچے۔ میں بھی یہیں تمہارے پاس ہوں۔ شنو سے کہا تھا کہ کھانا اوپر ہی لے آئے۔“ میں نے شنو کو کھانا مینو کے کمرے میں لانے کے لیے کہا تو وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کے دیکھتی رہ گئی۔ اس کے کسی سوال سے بچنے کے لیے میں نے مناسب جانا کہ میں کھانا خود ہی لے کر آؤں اور اس نے یہی کیا۔ کارپٹ پہ لڑے رکھ کے میں نازنین کا ہاتھ تھام کے اسے رائٹنگ ٹیبل سے اٹھا کے لایا۔ کارپٹ پہ آلتی پالتی مار کے بیٹھنے ہوئے میں نے اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئی..... مگر یہ کہتے ہوئے۔

”مینو کو کارپٹ یہ..... اور فرش پہ بیٹھ کے کھانا کھاتا بہت اچھا لگتا تھا ناں صاعد۔“ میں سن ہو کے رہ گیا۔ نادانستگی میں مجھ سے یہ کیسی عجیب سی حرکت سرزد ہوئی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کمرے میں کوئی دوسری ٹیبل نہیں تھی۔ جس پر میں لڑے رکھتا ورنہ یوں نیچے بیٹھ کے کھانا نہ میری عادت تھی نہ ہی عام حالات میں میری پسند۔ بہ شکل خود پہ قابو پا کے میں نے پلیٹ اس کے آگے رکھی اور ڈوگس سے ڈھکن اٹھائے۔ ایک بار پھر مجھے دھچکا سا لگا۔ خشک ہوتے مطلق کے ساتھ میں نے نازنین کو دیکھا۔ میں جانتا تھا اب وہ کیا کہے گی..... اور اس نے وہی کہا۔

”آج مینو کی پسند کا کھانا بنا ہے؟ مسالے والی بھنڈیاں؟ قیہ کڑا ہی اور وہی بڑے۔“ یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا۔ روز کھانا نازنین ہی بنایا کرتی تھی۔ آج اس کے نیچے نہ اترنے پر مئی نے قیہ کڑا ہی بنادیا تھا اور شنو سے کوئی سی بھی سبزی بنانے کو کہا تھا۔ وہی بڑے پاپا مارکیٹ سے لیتے آئے تھے مگر نازنین کی بات پر میں یوں چور سا

بن گیا جیسے یہ میرا ہی کیا دھرا ہو۔ خاموسی سے میں نے اس کی پلیٹ میں کھانا نکالا جسے اس نے اتنی ہی خاموشی سے کھالیا اور نہ مجھے خدشہ تھا کہ وہ دوپہر کی طرح اس وقت بھی کھانا کھانے سے انکار نہ کر دے۔

”قیہ مڑے کا تھا“ مینو کو ضرور پسند آتا..... لیکن بھنڈی اسے صرف میرے ہاتھ کی بنی پسند تھی۔ اتنے تیز مسالوں والی بھنڈی تو اسے کبھی..... بات کرتے کرتے وہ اچانک سسک پڑی۔ آنسو ایک بار پھر رواں ہو گئے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اس نے خود کو سنبھال لیا ہے۔ مینو بھلانے والی ہستی تو نہیں تھی اور نازنین سے اس کا جو رشتہ تھا اس لحاظ سے اس کے لیے مینو کو بھلانا تو تقریباً ناممکن ہی تھا لیکن پھر بھی مجھے لگا تھا جیسے اس غم کو ناز نے اپنے اندر اتار لیا ہے اور میری یہ غلط فہمی آج دم توڑ گئی ہے۔ یہ غم اب بھی اسے تر پار ہا تھا۔ اس کی تڑپ مجھ سے دیکھی نہ گئی۔ میں آتے ہوئے مئی کی مسکن دوا لے آیا تھا، وہ میں نے اسے پانی کے ساتھ کھلا دی اور مینو کے بستر پر ہی لٹا دیا۔ اس کی بیگنی آنکھیں کچھ ہی دیر بعد بوجھل ہو کے بند ہو گئیں۔

اور..... میں..... میں..... اکیلا رہ گیا۔ اس کمرے میں مینو کے کمرے میں۔



گزیال لگ رہی تھی۔

اور یہ تصویر..... مینو کی پانچویں سالگرہ کی تصویر۔ جس میں وہ اپنے ماما پاپا کے درمیان بیٹھی ہے۔ اس نے سفید نیکی پکین رکھی ہے اور سر پہ سفید موتیوں کا تاج۔ بالکل پری لگ رہی ہے۔ اس تصویر میں ناز و نبیس ہے مگر مجھے آج بھی یاد ہے اس نے اس دن ریڈ کڑھائی والا اور شیشوں کے کام والا بلیک سوٹ پہنا تھا پہلی بار میں نے اسے کھلے بالوں کے ساتھ دیکھا تھا اور تب مجھے لگا تھا کہ نازو..... انکل کی سڑیل سی بیگنی کتنی بڑی ہو گئی ہے اور خوب صورت بھی۔ ان دنوں وہ میزک میں تھی اور میں شاید فرسٹ ایئر یا چھریکنڈ ایئر..... اور اس مضمی سی سفید پری نے پتا نہیں اسکول جانا شروع کیا تھا یا نہیں۔

اور یہ تصویر۔ یہ شاید اس کی اپنے ماما پاپا کے ساتھ آخری تصویر تھی۔ اسی لیے اس نے اسے تمام تصاویر کے درمیان نمایاں کر کے لگایا ہوا ہے۔ یہ ہماری فیملی کے ہی کسی فنکشن کی تصویر ہے شاید صائم بھائی کی شادی کے موقع پر کھینچی گئی ہے۔ ہاں یاد آیا۔ ان کی مہندی کے روز..... اس شام ناز نے یہی پیلا اور سبز کرت پاجامہ پہنا تھا۔ کریم کلر کے شلوار قمیص اور سیاہ داسکت میں انکل کتنے بیک لگ رہے ہیں اور انٹی ٹاؤسی رنگ کی ستاروں بھری ساڑی میں کتنی دلکش ہے پتا تھا یہ ان کے آخری دن ہیں کسی کو بھی نہیں۔ ان کے درمیان کھڑی دونوں کی انگلیاں اپنے مہندی والے نغصے ہاتھوں میں تھامے گونا گئے پہلے لپٹنے والی مینو کو بھی نہیں۔

اور یہ تصویر ہمارے گھر آنے کے بعد کی ہے۔ دس سال کی ہے مینو یہاں۔ صائم بھائی کے گھر بیٹا ہوا تھا اسی کو اٹھا کے کھڑی ہے اور یہ اس کے کچھ عرصے بعد کھینچی تصویر۔ میرے ساتھ جوئے لینڈ میں ہم دونوں کے ہاتھ میں کون آکس کریم پکھل

ناز مین کے سونے پر میں نے اسے چادر اوڑھائی اور لائٹ آف کر دی۔ اندھیرے سے میرا جی الجھنے لگا تو میں رائٹنگ ٹیبل کی جانب گیا اور لیپ آن کر دیا۔ ٹیبل کے ساتھ والی دیوار پر لیپ کی روشنی گئی اور وہ ساری تصویریں روشن ہو گئیں۔ میں ایک کے بعد ایک پہ نظریں دوڑانے لگا اور مجھے سمجھ آ گیا کہ ناز مین کن نازک یادوں سے گزر کے اس حالت تک پہنچی ہے۔ میں نے نظریں چرا کے دھیان دوسری جانب لگانا چاہا مگر ایسا کر نہ سکا۔ وہ تصویریں میری توجہ کھینچ رہی تھیں۔ میں بے بس ہو کے ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

وہ تصویر جس میں مینو صرف چند ماہ کی تھی اور دس سالہ ناز مین کی گود میں اس کے چہرے کو تک رہی تھی۔ دلی پستی کی ناز و انگلی سے سامنے اشارہ کرتے ہوئے شاید مینو کی توجہ کیسرے کی جانب کرنا چاہتی تھی مگر وہ اپنی بڑی بڑی بھوری آنکھیں اپنی بڑی بہن پہ گاڑے ہوئے تھی۔ سفید اور میرون اوئی کپڑوں میں لپٹی وہ کوئی خوب صورت

رہی ہے اور نہ جانے کس بات یہ ہم اسے کھانا بھول کے بس پہننے ہی جا رہے ہیں۔
یہ تصویر بھی میرے ساتھ ہے۔ یہاں آنے کے بعد پہلی بار میں نے اس کی برتھ
ڈے سن بریٹ کی تھی۔ میرے منہ میں ایک کا پیش ڈالتے ہوئے وہ کتنی خوش نظر آ
رہی ہے اور یہ تصویر تب کی ہے جب میں جاپان جا رہا تھا۔
میری..... صرف اور صرف میری تصویریں؟ اس کے بعد کتنی بھی تصویریں تھیں
سب میں میں نمایاں تھا۔ شاید اس لیے کہ تب سے میں اس کی زندگی میں کسی اہم فرد کی
حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

اہم فرد..... اتنا اہم..... اتنا ضروری کہ وہ نہ ہوتا تو تم کبھی اتنی جلدی نہ مرتیں
میں نے سگریٹ سلگایا۔

”اف صاعد بھیا! سگریٹ..... پیا کو بتاؤں گی۔“ ہر جانب سے یہ آواز گونجی۔
میں نے گھبرا کے سگریٹ نیچے پھینک دیا۔
”تو بہ کتنا ڈرتے ہیں آپ پیاسے۔“ وہ ہنسی تھی۔

”ڈرتا نہیں چاہتا ہوں۔“ میں نے اپنی ننھی دوست کے سامنے اعتراف کیا تھا
اور آج بھی میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میں نازنین کو چاہتا ہوں۔ حد سے زیادہ.....
نہ صرف چاہتا ہوں بلکہ اس کی چاہت کی طلب بھی ہمیشہ مجھے رہی ہے۔ اسی طلب
کے ہاتھوں مجبور ہو کے میں نے کیا کیا نہ کیا تھا۔ ہر طرح سے اس کی محبت حاصل کرنا
چاہتی تھی اور ایک وہ تھی کہ مجھ سے کترائی کترائی رہتی تھی۔ اس تک میرے جذباتوں کی
آنج پھپھتی ہی نہ تھی اور میں..... میں تو عمری میں ہی اس کی محبت میں اتنا آگے نکل گیا
تھا۔ خصوصاً جب..... میرے علم میں یہ بات آئی کہ ہم دونوں کے پیرئس بہت پہلے
ہمیں منسوب کر چکے ہیں۔ یہ پتا چلنے کے بعد میری محبت کھل کے اس کے سامنے آنے

لی گروہ..... وہ پہلے کی طرح ہی نارل انداز میں ملتی۔ نارل یعنی روکھے پھیکے انداز
میں۔ یہی اس کا نارل رویہ ہوتا تھا میرے ساتھ۔ صائم بھائی کی شادی کے موقع پر
میں نے ہی ضد کر کے مانا پا کو اپنی باقاعدہ منگی کے لیے مجبور کیا تھا۔ میرا خیال تھا شاید
اس رشتے کی نوعیت واضح ہونے کے بعد اس کے دل میں میرے لیے گنجائش اور
رویتے میں تبدیلی پیدا ہو سکے۔ دل میں گنجائش پیدا ہوئی یا نہیں اس کا تو نہیں پتا البتہ
رویتے میں تبدیلی واضح طور پر آئی۔ اب وہ پہلے سے زیادہ کترانے لگی۔ پہلے تو سرسری
ساحال احوال پوچھ لیا کرتی تھی یا میرے سوالوں کا چند لفظی سادہ سا جواب۔ مگر اب
میں اس سے بھی گیا۔ اول تو وہ سامنے ہی نہ آتی تھی۔ آتی بھی تو نظریں نیچے کیے
سلام کر کے غائب ہو جاتی۔ میں تو اس کی ایک نظر کو ترس کے رہ گیا تھا۔ کاش وہ نظر اٹھا
کے میری جانب دیکھ لیتی تو میرے چہرے پر اسے میرے جذبے کو دیتے نظر آ
جاتے۔ اپنی تمام تر بیگانگی کے باوجود وہ میرے دل میں اترتی چلی گئی۔ میں اس سے
شاک کی ضرور تھا مگر اپنی محبت پہ بند نہیں باندھ سکا۔ میں اس سے حقیقتاً کتنی محبت کرتا ہوں
اس کا درست اندازہ مجھے بھی تب ہی ہوا جب ایک حادثے میں انکل آئنی دونوں کی
ڈھکھ ہو گئی۔ ظاہر ہے وہ میرے اکلوتے چچا تھے اور مجھے بے حد عزیز بھی اور سب سے
بڑھ کے یہ کہ ان کی جواں موت نے تو پرائیوٹ کو بھی آنسو بہانے پر مجبور کر دیا تھا میں تو
پھر رگ بھتیجا تھا۔ مجھے دکھ تو تھا مگر دل پھٹنا کے کہتے ہیں اس کا احساس تب ہوا جب
میں نے انکل کی میت پہ نازنین کو چھین مار کے روتے ہوئے دیکھا۔ وہ روی تھی اور
مجھے لگ رہا تھا میں کھل رہا ہوں۔

وہ تڑپ رہی تھی اور مجھے لگ رہا تھا میں جل رہا ہوں۔ اس کے آنسو بہہ رہے
تھے اور مجھے لگ رہا تھا میں ڈوب رہا ہوں۔ وہ میری تیس سالہ زندگی کا سب سے

دردناک منظر تھا۔ اپنے آپ کو اتنا بے بس اتنا کمزور میں نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا کہ جسے میں جان سے بڑھ کے چاہتا تھا وہ میرے سامنے بین کر رہی تھی اور میں اسے اس کی خوشیاں لوٹا نہیں سکتا تھا۔ اس حادثے کے دوسرے دنوں کو اپنے گھر لے آئے۔ ہمارے سوال کا تھا بھی کون۔ خاندان کے دوسرے لوگوں نے بھی اس فیصلے کی حمایت کی تھی کیونکہ کچھ عرصے پہلے ہی ہماری تنگی ہو چکی تھی اس لحاظ سے نازنین کا اب ہمارے گھر سے ہر ارشہ تھا اور وہ پورے حق سے یہاں رہ سکتی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ یہاں آنے پر خوش نہیں تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ یہاں آنا نہیں چاہتی تھی۔ جب باپا نے اسے یہ فیصلہ سنایا تھا تو وہ ایک لفظ بھی مخالفت کا کہے بغیر راضی ہو گئی تھی بلکہ یہ کہہ کر ان کا مان بڑھایا تھا کہ وہ ان دونوں کے تمام اختیارات رکھتے ہیں اور اپنے پیرنس کے جانے کے بعد وہ ان کا درجہ بھی انہیں ہی سونپتی ہے۔ اس لیے یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ باپا سے زبردستی نہیں لائے تھے مگر اس کا رویہ ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی انجان جگہ پر اجنبی لوگوں کے گھر ہو۔ پہلے تو اس کا بیگانگی بھر اردیہ صرف میرے ساتھ ہوتا تھا۔ ماما باپا کے ساتھ تو وہ بہت اپنائیت سے پیش آتی تھی اور اب میں اس اپنائیت کو تکلف میں بدلتے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کی وجہ کچھ نہیں آتی تھی مگر میں چاہتا تھا اور بلا خرابیک دن میں جان گیا۔ یہ اس کے ہمارے ہاں آنے کے دو ہی ہفتے بعد کی بات ہے۔ چھٹی کا دن تھا اور ناشتا وقتا فوقتا دوپہر تک ہی چلا کرتا تھا۔ اس دن کوئی مقررہ اوقات نہ تھے کسی کے ناشتا کرنے کے۔ میں تقریباً گیارہ بجے جاگا۔ کچھ دیر بعد ناشتا کرنے کیچن کی جانب آیا۔ ناشتا عوامارہ دابہ بھائی بنایا کرتی تھیں مگر مجھے لگا اندر نازنین موجود ہے۔ میں دروازے پر ک کے اس کی موجودگی کا یقین کرنے لگا۔ وہ وہی تھی اور سخت لہجے میں کسی کو ڈانٹ رہی تھی۔

”یہ کیوں طریقہ نہیں ہے کسی کے گھر رہنے کا۔ یہ وقت ہے تمہارے جاگنے کا۔ گیارہ سے اوپر کا وقت ہو رہا ہے۔“

”آج ہالی ڈے ہے پیا۔ روز تو اسکول کے لیے جلدی اٹھتی ہوں۔“ مینو کی بسورتی آواز سنائی دی۔

”پہلے کی بات اور مینو۔ اب ہم کسی کے گھر رہتے ہیں۔ دھیان رکھنا پڑتا ہے ان باتوں کا۔ کتنے دن سے سمجھا رہی ہوں میں۔ اب دیکھو تقریباً کبھی لوگ ناشتا کر چکے ہیں۔ روز تم صبح جاگتی ہو اور ٹیبل پر سب کے ساتھ ناشتا کر لیتی ہو اب بتاؤ! الگ سے تمہارے لیے ناشتا بنانا کتنا آکوروڑ لگے گا۔“ اس کے خیالات جان کے مجھے واقعی افسوس ہوا۔ وہ یہاں آ تو گئی تھی مگر خود کو بہمان تصور کرتی تھی۔ ابھی اسے کچھ عرصہ اسی حیثیت سے یہاں رہنا تھا۔ اگر تب تک وہ یونہی غیریت برتی رہے گی تو اپنے خود ساختہ اندیشوں اور احتیاطوں کی وجہ سے اپنے اور اس گھر کے کینوں کے درمیان دیوار بھی پیدا کر سکتی ہے۔

”آکوروڑ کیوں پیا کبھی کسی بریک فاسٹ لیٹ بھی تو ہو جاتا ہے۔ آپ فرنج میں سے دو اڈے لیں۔ آلیٹ بنائیں۔ بریڈوٹسٹ کرین اور ناشتا ریڈی یا پھر پر اٹھا چکا دیں۔ رات کا سائلن ہے؟“

”مجھے نہیں پتا۔“ وہ جھنجھالی ”میں فرنج کی تلاش نہیں لے سکتی نہ ہی کسی کی غیر موجودگی میں یوں ناشتا تیار کر سکتی ہوں۔ تم مجھے بتائیے کیوں نہیں مینو اور خدا کا واسطہ ہے اب یہ دو دواڈے لے کھانا چھوڑ دو موٹی ہو رہی ہو۔ ڈائٹ کنٹرول کرو۔“ مینو شاید اس نئے آؤرڈ پر ناراض ہو گئی تھی یا چپکے چپکے روئے لگتی تھی۔ مجھ سے اور رہائین گیا اور میں اندر آ گیا۔

”بھابی.....!“ میں نے یوں غماہ کر لیا۔ جیسے مجھے اس کی موجودگی کا پہلے سے علم نہیں تھا۔

”بھابی بچوں کا ناشتا لے کر اوپر گئی ہیں۔“ وہ رخ موڑ کے برتن دھونے میں مصروف نظر آنے لگی۔ میں نے میٹوک دیکھا، اس کی موٹی موٹی آنکھیں ڈیڈ بار ہی تھیں اور منہ سو جا ہوا تھا۔ مجھے اس آٹھ سالہ معصوم بچی پر ترس آیا جسے وہ بے وقوف نازنین اپنے بیکار کے دواہوں کی کھینٹ چڑھا رہی تھی۔ اپنی حد سے بڑھی احتیاط پسندی سے اسے تیشی کا احساس دلارہی تھی۔

”اوہ..... مجھے ناشتا کرنا تھا۔ اچھا میں ماما کو کہتا ہوں۔“

”آئی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ آپ مجھے بتائیں میں بنادیتی ہوں۔“ اس کی اس بات یہ میں نے مینوکو ترپ کے اس کی جانب شکایتی نظروں سے دیکھتے پایا۔ نازنین کا اس سے نظریں چراتا بھی مجھ سے چھپ نہ سکا۔ میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ اس بچی سے میرا رشتہ وہ تھا جو نازنین کا تھا مگر اس کی نظروں کا گلہ مجھے اندر تک ہلا کے رکھ گیا تھا پھر بھلا نازنین کے دل پہ کیا گزری ہوگی اس کے آنسوؤں سے۔ آخر وہ اس کی لاڈلی اور چھوٹی بہن تھی۔

”مجھے نازکو یہ احساس دلانا ہوگا کہ یہ گھر اس کا بھی اتنا ہی ہے جتنا ہمارا۔ اسے اجنبیت کی یہ دیوار گرانا ہوگی۔“ یہ تہیہ کر کے میں نے اس سے کہا۔ ”جو ناشتا مینو کے لیے بناری ہو وہی بناؤ میں بھی آج مینو کا ناشتا شیر کر دوں گا۔“

”مجھے ناشتا نہیں کرنا۔“ وہ روٹے روٹے انداز میں بولی۔

”یوں کہو میرے ساتھ نہیں کرنا۔ ارے بابا میں تمہارے حصے کا نہیں کھاؤں گا“ بیٹو ضرور ہندیا نہیں۔ ہری اب نازنین چارادلوں کا آلیٹ مگر سرخ مرچ مت

ڈالنا صرف کالی مرچ اور باریک کٹی ہری مرچیں۔ کیوں پائزہ تمہیں ہری مرچ سے کوئی پرابلم تو نہیں؟“ میں نے مینو سے اچانک سوال کیا تو اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا اور پھر سٹپ گئی کیونکہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ ناشتا کرنے سے انکار کر چکی تھی۔

”اور ساتھ میں ہوں دو تین کرارے سے پراٹھے چاراشمی کباب بھی فرائی کر لینا اور اگر فریج میں رات کی بچی کوئی وال ہے تو وہ بھی رکھ دینا مگر ٹھنڈی۔ ناشتے میں گرم گرم پراٹھے کے ساتھ ٹھنڈی ٹھنڈی مسوکی وال کھانے کا مزہ ہی اور ہے۔ ناشتا ہو اور ساتھ لسی نہ ہو یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ پائزہ آپ کون سی لسی پیٹا پسند کریں گی، مٹھی یا نمکین؟“ وہ اس بار چپ رہی اور کن آنکھوں سے نازنین کی جانب دیکھا جو تذبذب کے عالم میں کھڑی تھی۔ شاید وہ بھانپ گئی تھی کہ میں نے اس کی باتیں سن لی ہیں۔

”ارے یا تم کھڑی کیوں ہو، بہت سست لڑکی ہو بھی۔ جلدی سے ناشتا بنانا شروع کر دو پونے بارہ ہو رہے ہیں۔ آخر میں لڑکی کس وقت کروں گا؟“

اس نے فریج کھول کر آتا ہوا ہر نکال کے رکھا، اس کے بعد مکھن اور انڈے نکال رہی تھی جب رو دا بھابی اندر داخل ہوئیں۔ میں نے ان کے آتے ہی نازنین کے چہرے سے رہا سہا اعتماد بھی رخصت ہوتے دیکھا۔ مجھے حیرت ہوئی، کیا ایسا آج پہلی بار ہوا ہے یا میں نے ہی آج توجہ دی ہے؟

”نازنین کیا کر رہی ہو؟“ وہ یوں حیرت کا مظاہرہ کرنے لگیں جیسے سمجھنے سے قاصر ہوں کہ وہ ہاتھ میں انڈے لیے آخر کیا کرنے جا رہی ہے۔

”جی وہ میں ناشتا..... آئی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو میں.....“ پتا نہیں کب تک وہ ہکتی رہتی کہ میں نے مشکل آسان کی۔

”بھابی وہ ہمارے لیے ناشتا بنارہی ہے۔“ میں نے دانستہ ”میرے“ کہنے کے

بجائے "ہمارے" کا لفظ استعمال کیا۔

"کمال کرتے ہو تم صاعد۔ نازنین بے چاری کو کیوں کام کا کہہ رہے ہو مجھ سے کہا ہوتا۔"

"وہ بے چاری کب سے ہو گئی۔" مجھے ان کا انداز ناگوار گزرا مگر اپنا لہجہ حتی الامکان ہلکا پھلکا ہی رکھا "اور دو بندوں کا ناشتا بنانے میں کون سے مل جوتے پڑتے ہیں۔"

"پاکل..... یہ اس کی ذمہ داری تو نہیں۔" وہ نازنین کے ہاتھ سے اٹھ لے کر برزکھولے لڑکھیں۔ "اور تم تازہ..... کتنی باریکبار ہے کہ تم پلیز خود کو مت تھکایا کرو۔ میں کر لیا کروں گی سب۔ اتنا کام تو ہوتا ہی نہیں ہے۔ تم جاؤ آرام کرو۔" وہ بظاہر اس سے بہت پیار جتاتے ہوئے نرم لہجے میں کہہ رہی تھیں مگر تازہ کے پچھلے پڑتے چہرے سے مجھے ساری کہانی سمجھ آ گئی۔

"اوہ تو یہ بھالی ہیں جو اسے مہمان کے زیادہ کا درجہ دینے پر تیار نہیں۔ حالانکہ جانتی بھی ہیں کہ وہ اس گھر کی جتنی ہونے کے علاوہ بہو بھی بننے والی ہے۔" اس وقت بھالی سے الجھنا متا سب نہیں تھا۔ بات الٹی بھی ہو سکتی تھی۔

"اور پھر اسے کیا پتا کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔ جتنی کس ڈبے میں ہے بچے کس خانے میں ہیں۔ خواہ مخواہ اپنا سر کھپائے گی۔"

"آپ بتائیں گی تو پتا چلے گا۔ کبھی تو اسے جانتا ہی ہے کہ کون سی چیز کہاں پڑی ہے۔" میں نے نامحسوس طریقے سے جتایا پھر ساتھ ہی شور مچا دیا۔ "بھوک لگی ہے بھی۔"

جلدی کریں۔ نازہ جب تک بھالی آلیٹ نہ باری ہیں تم پر اٹھتے تو ڈالو۔" اس بار بھالی منع نہ کر سکیں۔ پتا نہیں وہ کیا چاہتی تھیں مگر ان کا یہ ناقابل فہم رویہ نازنین جیسی حساس

اور خود دار لڑکی کو الجھار ہاتھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ موقع ملے ہی میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ ان کی باتوں کو سیر۔ سلی نہ لے۔ جو درجہ انہیں اس گھر میں حاصل ہے وہی درجہ اس کا بھی ہے۔ وہ اس گھر کو اپنا گھر ہی سمجھے اور ہر چیز استحقاق سے استعمال کرے مگر یہ سمجھانے کے لیے موقع کی ضرورت تھی۔ وقت کی بھی اور اس کی بھی جو ہاتھ ہی نہ آتی تھی۔ جب میں گھر میں ہوتا کہیں نہ کہیں غائب ہی رہتی۔

جلدی ہی اس کے ایف۔ ایس۔ ی کے امتحانات شروع ہو گئے وہ اور بھی مصروف ہو گئی۔ ایسے میں ایک رات اچانک مجھے اس سے بات کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں سونے جا چکے تھے۔ یہ ہمارے گھر کا معمول تھا کہ چاہے سب اپنی اپنی مرضی سے اپنے اپنے وقت پہ سوئیں مگر رات کے کھانے کے بعد آدھا گھنٹا بیٹھ کے کپ شپ کرنے کے بعد سب اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے تھے۔ جس کا دل چاہے ٹی وی دیکھنے، مطالعہ کرے یا سوئے۔ میں اور صائب ویڈیو گیمز کھیل رہے تھے کہ مجھے باہر کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں۔

"یار دیکھو بھالی چائے بناری ہیں تو دو کپ اپنے لیے بھی لے آؤ۔" صائب نے کہا اور میں نے کچن میں جھانکا تو بھالی کے بجائے وہ تھی۔ مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ اسے اچانک سامنے پائے کے بھی اور اس خیال سے بھی کہ اس نے خود کو مہمان سمجھنا چھوڑ دیا ہے۔ کتنی ہی دیر میں چپکے سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ کتنی سادہ مگر دلکش لگ رہی تھی۔ صبح سے پہنا کاٹن کا پلیٹن آسانی سوٹ ممکن آلود تھا۔ کالا دوپٹا بے پروائی سے دائیں شانے پہ جھول رہا تھا شاید کسی کی موجودگی کے آثار نہ ہونے کے احساس سے۔ درنہ عام طور پر وہ بہت لمبی پٹنائی رہتی تھی۔ بالوں کی لمبی چٹیا کے کئی بل بے ترتیب ہو چکے تھے۔ شاید وہ بچپن سے ٹیک لگا کے لپٹی تھی۔ کافی ٹانگ لے کر وہ پلیٹن تو مجھے سامنے

پاکے اس کے چہرے پہ گھبراہٹ کے آثار پیدا ہو گئے جسے کم کرنے کے لیے میں مسکرایا گر وہ اور بھی نزوں ہوتی ہوئی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”تم مجھ سے اتنی اکھڑی اکھڑی کیوں رہتی ہو؟“ میں نے بات شروع کرنے کے لیے تہیڈ بانڈی۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ بار بار ہر کی جانب دیکھ رہی تھی۔ خوف زدہ بھی لگ رہی تھی شاید اس لیے میری اگلی بات کے جواب میں اس نے بڑے منت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

”تم.....تم پلیز جاؤ صاعد۔“

”نہیں جاتا۔“ اس کا یہ گھبراہٹ یا روپ مجھے اتنا بھایا کہ اسے ستانے کی غرض سے میں اڑ گیا۔

”تو پھر مجھے جانے دو۔“ اس نے سائیڈ سے گزرنے کی کوشش کی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے ہی لاؤنچ میں آ گیا اور ساری لائسنس آن کر دیں۔ ٹی وی لگا کے میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”آؤ کچھ دیر بیٹھ کے باتیں کرتے ہیں، میوزن سننے ہیں، اکٹھے میچ دیکھتے ہیں تم نے تو خود کو بالکل ہی محدود کر کے رکھ دیا ہے۔ پلیز نازو اپنے خول سے باہر نکلو۔ دکھ بانٹنے سے کم ہوتے ہیں۔ دل ہلکا ہو جاتا ہے۔ ارے ابھی تک کھڑی ہو اتنی دیر میں تو ایک کپ کافی اور بن جاتی۔ کیا اکیلے اکیلے پیو گی؟“

اس نے اپنا کپ خاموشی سے میرے آگے رکھ دیا۔ ”مجھے پڑھنا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ پلٹ گئی۔

”پلیز نازو کچھ دیر..... میں تھوڑا سا وقت تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔

کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

میری التجا پہ وہ میز میوں پہ رک گئی مگر پلٹ کے دیکھے بغیر آہستہ آواز میں کہا۔
”میں تو کمرے میں اکیلی بے ڈر جائے گی۔ مجھے کس کے پاس جانا ہے۔“ میں چپ کر گیا، بھلا کیا کہنا تھا۔ پہلے پڑھنے کا بہانہ..... پھر مینو۔ مجھے اس کی پڑھائی اور اس کی بہن دونوں پہ غصہ آیا۔



نازنین کی مکمل توجہ چاہتی تھی۔ اس کا بھرپور وقت جسے نازنین جھٹلا بھی نہیں سکتی تھی۔ بہر حال یہ اس کی ذمہ داری تھی۔ اس طرح وہ فرض ڈنٹے داری مقصد سب میں الجھ کے رہ گئی۔ اس دن بھی اسے لائبریری ضروری جانا تھا اور چونکہ مینو کا آج ہاف ڈے تھا اس لیے وہ چاہتی تھی کہ جو وہ گھر لوٹے تو اس کی پیامو موجود ہوتا کہ وہ اس کے ساتھ زیادہ وقت گزار سکے۔ ناز کا ناشتا اس کے سامنے پڑا ہوا تھا اور وہ مینو کو پیار سے بہلا پھسلا کے کسی نہ کسی طرح منانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ قریب تھا کہ وہ مینو کی ضد کے آگے ہار مان جاتی کہ رو دیا۔ بھائی نے بڑا عجیب سا تبصرہ کیا۔

”یوں تو ہو چکی پڑھائی۔ ایک اور سال ضائع۔“ ان کی اس مذمہ بڑ بڑاہٹ پہ نازنین ایک بار پھر ہچکچاہٹ میں مبتلا ہو گئی۔ مجھ سے اس کی یہ کھٹکھٹ دیکھی نہیں گئی۔ حالانکہ وہ میری محبت کا جواب اب بھی اس بے اعتنائی سے دیتی تھی مگر پتا نہیں کیوں میرا دل اپنا چلن چھوڑنے پر راضی نہ تھا۔ وہ اب بھی اسے دیکھ دیکھ سے بھر جاتا تھا۔ وہ اب بھی اسے بہر حال میں خوش اور صرف خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے رو دیا۔ بھائی پہ سخت غصہ آیا جواب اس حساس لڑکی کو ایک نئے دواپے میں جلا کرنے چلی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ منہ پھلا کے اکڑ کے بیٹھی اس چھوٹی سی لڑکی پہ بھی تاؤ آیا جو بلاوجہ میری نازنین کو پریشان کر رہی تھی مگر میرا غصہ..... میرا تاؤ دکھانا اس مسئلے کو ختم نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ اور کرتا مجھے اور میں نے وہی کیا۔

”کمال ہے آج تو میرا بھی ہاف ڈے ہے۔“ وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے ایک بہانہ تراش لیا اسے بھلانے کا ”کیوں نہ جو اپنے لینڈ چلا جائے۔ مزے کریں گے۔“ میری آفر یہ اس کی اداس اور خفا خفا سی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ دو تین اور ایسی باتوں پہ وہ تقریباً تقریباً راضی ہو ہی گئی۔

”مینو تمہاری دین.....“ صاحب نے پکارا۔ میں نے ہاتھ آگے کیا۔
”تو پھر ڈن.....“

”ڈن.....“ اگلے ہی لمحے میرے ہاتھ میں اس کا نرم گلابی چھوٹا سا ہاتھ دبایا تھا۔ یہ ایک نئے تعلق کا آغاز تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ مجھے مینو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نہ اس کی محرومی سے نہ اس کی تنگی سے۔ ہاں مجھے اس سے ہمدردی ضرور تھی ایسی ہی ہمدردی جو کسی بھی انسان کو کسی ایسی بچی سے ہو سکتی ہے جو آٹھ سال کی عمر میں اپنا باپ اپنی ماں اور اپنا گھر کھو چکی ہو۔ ویسی ہی عام سی سرسری ہمدردی۔ جس میں بس ”اوہو.....“ چہ چہ.....“ کہہ کے فرض نبھادیا جاتا ہے۔ اس کے آنسو پونچھنا اور اس کے لبوں پہ مسکراہٹ لانا تو میرے ذمے داری تھی نہ میری خواہش۔ اس کے باوجود حیرت کی بات تھی کہ میں یہ کر رہا تھا۔

کس لیے؟ صاف صاف جواب ہے صرف اور صرف نازنین کے لیے۔ میں اس سے محبت کرتا تھا اور جس سے محبت کی جائے اس کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے کو دل چاہتا ہے۔ وہی میں کر رہا تھا۔ میں نے ماما کو نامحسوس طریقے سے رو دیا۔ بھائی کی اجارہ داری کا احساس دلایا تھا۔ نازنین کو اجنبیت دور کرنے میں ماما کی کوششیں میرے اس احساس دلانے کا نتیجہ تھیں۔ میں نے اسے اپنی ماما کی خواہش پوری کرنے کا موقع دیا تاکہ اس کے دل میں یہ خلش نہ رہے کہ وہ مجبور تھی دوسروں کے رحم و کرم پر تھی اس لیے اسے ایک اور موقع ملے گا اور اب میں اس کی ذمہ داری بانٹ رہا تھا اس کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے۔ ایمان داری سے اعتراف کروں گا کہ میرے اس عمل کے پیچھے میری محبت تھی بے لوث محبت جو صرف دینا جانتی تھی۔ ابھی تک اسے لینے کا تجربہ نہ ہوا تھا ہاں خواہش ضرور تھی۔ میں نے اپنے اس عمل کے پیچھے اس وقت کوئی

غرض نہ دیکھی تھی۔ نہ میں ایسا کر کے ناز میں کو زیر بار کرنا چاہتا تھا نہ منوں نہ ہی اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانا چاہتا تھا مگر میرے ایسا نہ سونپنے کے باوجود یہی ہوا۔

میرے وعدے پہ بھل کے جب مینو اے مزید تک کیے بغیر آرام سے اسکول چلی گئی تو پاپا نے اسے لائبریری تک چھوڑنے کی ڈیوٹی بھی میرے سپرد کی جسے میں نے بسر و چشم قبول کیا۔ ایسے نادر مواقع روز روز کب ہاتھ ملکتے تھے۔ حالانکہ میں جانتا تھا وہ مجھ سے ادھر ادھر کی تو کیا ضروری باتیں تک کرنے سے گریز کیا کرتی تھی اور میں بھی صائب کی موجودگی میں زیادہ سے زیادہ کیا کھسکا تھا مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ میرے ساتھ بیٹھی میرا شکریہ ادا کر رہی تھی۔

”تھینک یو صاعد! آج تمہاری وجہ سے میری مشکل میرا مطلب ہے کہ مینو مجھے بہت.....“ شاید اسے مجھ نہ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی مجھ سے اس کی مشکل برداشت نہ ہوئی۔

”تو تم کیوں تھینک یو کہہ رہی ہو مینو؟“ کہنا تو مینو کو چاہیے یا پھر مجھے مینو کو۔ کیونکہ اس کی وجہ سے آج میں بھی عرصے بعد جو اپنے لینڈ جاسکوں گا۔ جموں پو بیٹھ کے اپنے بچپن کی یادیں تازہ کر سکوں گا۔ تمہیں تو پتا ہے اکیلے مردوں کو وہاں انٹری کی اجازت نہیں ہے۔ ناں علم؟ ویسے تم کیوں نہیں ساتھ چلتیں؟“ بلا ارادہ ہی میں نے اسے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ میں بھول گیا تھا کہ اس کی مصروفیت کی وجہ سے ہی تو میں نے یہ پروگرام بنایا ہے۔ وہ بھی حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں چلی ہو گیا۔

”میرا مطلب ہے تم شام کو ایڈمی جاتی ہو۔ اگر لائبریری سے جلدی آ گئیں تو ہم تمہارے ایڈمی جانے کے وقت سے پہلے پہلے لوٹ آئیں گے۔“

”مجھے لائبریری سے واپس آ کے اپنے نوٹس فائل کرنے ہیں۔“ یہ بہانہ نہیں تھا

مگر مجھے لگا۔ میں مجھ کے رہ گیا۔ کیا تھا جو یہی بات وہ اس طرح کہتی جیسے وہ جانتا تو چاہتی ہو مگر مجبوری کی وجہ سے جانا پاری ہو، میرا دل رہ جاتا۔ پھر صائب کے ویلے کان لٹا کر نے تک میں چپ ہی رہا۔ جیسے ہی ہم دونوں کے درمیان تہائی کا احساس جاگا میں ایک بار اپنے دل کی خواہش اس سے بیان کرنے سے خود کو روک نہ سکا۔

”میں کچھ وقت تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔ اکیلے بالکل اکیلے.....“ مجھے پتا تھا اس کے پاس میری اس خواہش کا کوئی جواب نہ ہوگا۔ وہ یا تو ان سنی کر کے باہر دیکھنے لگ جائے گی یا مجھ پہ ایک سرد خشک سی نظر ڈال کے دوبارہ کتاب میں مگن ہو جائے گی۔ اس کے باوجود میں دل کی بات دل میں رکھ نہ سکا تھا اور تب مارے حیرت کے میں بے ہوش ہی تو ہونے لگا جب اس نے بے حد جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

”ہم کچھ دیر یہاں بیٹھ سکتے ہیں۔“ میں نے ایک لمحہ رک کے اس کی پیشکش پہ غور کیا پھر ایک نظر کیپس کی نہر کے گرد رواں ٹریفک اور آس پاس گروپس کی شکلوں میں کھڑے اسٹوڈنٹس کو دیکھا، دوسری نظر اس کے گھبرائے ہوئے چہرے پہ ڈالی۔ وہ میری خواہش پہ مجھ پر رضامندی کا انہار کرنے کے بعد ہی اتنی زور سے نظر آ رہی تھی تو یہاں میرے ساتھ بیٹھ کے اس کی کیا حالت ہوتی۔ میں مسکرا دیا۔

”تم نے شاید سنا نہیں۔ میں نے کہا اکیلے..... بالکل اکیلے۔“ اس بار وہ سر جھکا کے رہ گئی۔ میرے لیے یہی بات تھا۔ آج پہلی بار میرے کسی جذبے کی آج اس تک پہنچی تھی، وہ بھی صرف اور صرف مینو کی وجہ سے۔ جو ذمہ میں نے یونہی جذبات میں آ کے لے لیا تھا اور جس کے بارے میں میں سوچ سوچ کے گھبرا رہا تھا کہ اس ضدی اور اڑیل بچی کے ساتھ دو دھاتی گھسنے گزارنا کتنا ٹھن ہے وہ ذمہ میں نے اب بڑے دل سے نبھایا۔ میں اس کا مشکور تھا اس لیے اس کی ہر انٹی سیدھی حرکت ہنس کے پی

گیا۔ واپسی پر گھر لوٹے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ وقت اتنا برا بھی نہیں گزرا۔ میں نے مینو کے چہرے پر نظر ڈالی۔ ہمارے گھر آنے کے بعد پہلی بار وہ اتنی خوش نظر آ رہی تھی۔ اس کی روتی ہوئی شکل اس وقت کھلے ہوئے پھول جیسی شکفتہ لگ رہی تھی۔ بھڑی آنکھوں میں جگنو چمک رہے تھے۔ بات بات پر مسکراتے ہونٹ..... اور کھلتا ہوا لبید۔

”صاعد بھیا“ آپ کتنے اچھے ہیں“ کتنے سویت۔“ اس نے آنکھیں میچ کے کہا تھا اور تب وہ مجھے واقعی بہت پیاری لگی۔ میں اس کے بال لاڈ سے بگاڑنے لگا۔
 ”اوں ہوں.....“ وہ کسائی ”اتنے اچھے بھی نہیں۔“ اور پھر قل قل کرتی ہنسی میرے چاروں اور یہ احساس بن کے چھا گئی کہ کس روئے ہوئے وجود کو امیدوں سے بھر دینا کتنا خوش کن ہوتا ہے۔

”تھینک یو صاعد۔“ ایک بار پھر نازنین میرے زرد پتے اور ایک بار پھر وہی تشکر آمیز الفاظ ”اس بار میں رسماً نہیں دل سے کہہ رہی ہوں۔“ شاید وہ مینو کو خوش دیکھ کر میری مومن ہو رہی تھی۔

”تمہارا دل تھینک یو کی گردان کرنے کے علاوہ بھی کچھ ہوتا ہے؟ اور ہاں..... تو کسی دن چپکے سے بتا دو۔“ میں نے کریدنا چاہا جسے وہ نظر انداز کرتے ہوئے بات پلٹ گئی۔

”مینو کو آج عرصے بعد یوں کھلکھلاتے دیکھا ہے۔ وہ بہت خوش ہے۔“

”اور تم؟“ میں صرف اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔

”مینو کو خوش دیکھ کے میں بھی خوش ہوں۔“ وہ سادگی سے بولی مگر مجھے لگا جیسے وہ میرے سوال کی گہرائی سے بچنے کے لیے مینو کی ذات کی آراء رہی ہے۔ مجھے ایک

بار پھر اس آٹھ سالہ بچی کا وجود کھلنے لگا جس کے ذکر کے بغیر نازنین کی ہر بات ادھوری تھی اور نازنین..... جس کے بغیر میری ذات ادھوری تھی۔

”اور تمہیں خوشی دے کر میں بھی بہت خوش ہوں۔“ میں نے اسے جتنا چاہا کہ یہ سب میں نے مینو کو نہیں بلکہ اسے خوش کرنے کے لیے کیا ہے۔ اپنا ”یاز“ راضی کرنا چاہا ہے اور پھر اس کے بعد میں نے کتنی ہی کوششیں کیں۔ اسے یہ یاد کرانے کے لیے کہ وہ میرے لیے کتنی اہم ہے۔ اتنی اہم کہ میں صرف اس کے لیے صرف اس کی سہولت اور اطمینان کے لیے اپنے بہت سے ضروری کام ہنس پشت کے مینو کو وقت دیتا ہوں۔ پتا نہیں اسے یہ احساس کب ہوا۔ ہوا یا نہیں..... لیکن اس سے پہلے میں کسی کے لیے اہم ہو گیا۔



کے دل میں جگہ پانے کے لیے اس کی سب سے عزیز ہستی سے تعلق مضبوط کر رہا تھا۔
ہر دو جگہ تیرا زمینیں ہی تھی۔

ہم دونوں جب ”دو“ ہوتے تب بھی وہ ایک ”تیرا“ وجود بن کے ہمارے
درمیان موجود ہوتی۔ ہماری باتوں میں ہمارے دلوں میں۔ مجھے میتو دو جو بات کی وجہ
سے عزیز تر ہوتی چلی گئی۔ ایک وجہ تو یہ کہ وہ تیرا زمین کو بے حد چاہتی تھی یعنی کہ
ہماری چاہت مشترک تھی۔ جو میری ”چاہ“ کو چاہے گا۔ مجھے تو اچھا ہی لگے گا ناں اور
دوری وجہ یہ تھی کہ تیرا زمین اسے بے حد چاہتی تھی۔ جسے وہ چاہے وہ مجھے کیسے برا لگ
سکتا ہے۔



میتو کے لیے۔ اس کا معصوم ذہن مجھے اہنا سب کچھ جاننے لگا۔ وہ میری محبتوں
کی عادی ہوتی چلی گئی اور میں چاہنے کے باوجود بھی اب اس سے دامن نہیں چھڑا سکتا
تھا۔ کیونکہ جہاں یہ سچ تھا کہ اس کے قریب جانے کی ایک بڑی وجہ تیرا زمین کی توجہ اور
خوشنودی حاصل کرنا تھا وہاں یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ ایسا کرنے کے دوران میں خود
میتو کے سچ قریب ہو گیا۔ اس کی محنت بے غرض تھی۔ اس کا میرے لیے پیارا دلہانہ
تھا اس کی شدت میں بے ساختگی تھی۔ اب اگر تجزیہ کرنے بیٹھوں تو یہ احساس ہوتا ہے
کہ ان دونوں اگر تیرا زمین کی ذات کو سچ میں سے نکال بھی دیا جاتا تب بھی میرا دل میتو
سے بندھ چکا تھا۔ وہ تھی ہی اتنی پیاری اور معصوم۔ لیکن تیرا زمین کا وجود نکلتا تو کیسے۔
وہ تو ہم دونوں کے درمیان ایک ڈور تھی۔

ایک میتو تھی جو تیرا زمین کے دور ہونے اور اس کی کمی میری ذات سے پوری کرنے
میرے نزدیک ہوئی تھی۔ ایک میں تھا جو تیرا زمین کی نظروں میں آنے کے لیے اس

سنڈریلا کی اسٹوریز سنتے ہوئے گزرتا۔ وہ نازنین سے زیادہ مجھ پہ اٹھار کرنے لگی تھی۔ کبھی کبھی اس کے کسی سخت رویے سے دل برداشتہ ہو کے اس کی شکایت بھی مجھ سے ہی کیا کرتی۔ جب سے اس نے اس گھر کو اپنا گھر مان لیا تھا وہ دوسرے افراد سے بھی گھٹنے ملنے لگی تھی۔ وہ اتنی پیاری تھی کہ سب کا دل موہ لیتی تھی۔ پہلے اپنے کمرے میں بند رہتی مٹی مٹی تھی اس لیے کوئی اس کے قریب نہ آ سکا مگر میرے دیئے ہوئے اعتماد کے سہارے اب وہ ہمارے گھر کی لاڈلی اور چپکٹی ہوئی بلبل تھی۔ ہمارے گھر کی رونق۔

ماحول اب پہلے کی نسبت خاصا سکون تھا۔ صائم بھائی جان بھائی اور بچوں سمیت اسلام آباد شفٹ ہو چکے تھے۔ صائب اپنی انجکشن کے سلسلے میں انگلینڈ میں تھا۔ ماما نے بھی پوتوں پوتیوں کے دور جانے پہ ان کی کمیوں کے وجود سے پوری کرنا چاہی تھی۔ نوٹی چار سال گزر گئے۔ جس فرم میں کام کرتا تھا وہ مجھے ٹریننگ کے لیے دو سالہ کورس کے سلسلے میں جاپان بھیج رہے تھے اس کے بعد میری پروموشن تھی تھی۔ یہ ایک بڑے کشش ذیل تھی جس میں نے فوراً قبول کر لیا۔ دو سال ہوتے ہی کتنے ہی ہیں مگر گھر میں اس بات کا ذکر سارے ماحول کو افسردہ کر گیا۔ اتفاق سے اسی دن نازو کا آخری پرچہ تھا۔

”میں نے تو سوچا تھا فرض سے سبک دوٹی کا وقت آ گیا۔ اب تم دونوں کی شادی کر دوں گی۔ بیٹی بہت بڑی ذمے داری ہوتی ہے اور وہ بھی پرانی۔ ہمارے شانون پہ تو دوہرا بوجھ ہے۔ تمہارے چچا جو ذمے داری دے گئے ہیں اسے بھی نبھانا ہے اور ان سے نازو کو اپنی بہو بنانے کا جودہہ کیا ہے اسے بھی پورا کرتا ہے۔“

”یہ دوہری ذمے داری تو نہ ہوئی۔“ میں نے ہلکے پھلکے انداز میں ان کی سنجیدگی

ان چار سالوں میں اس کا اور میرا رشتہ اتنا ہی گہرا ہو گیا جتنا میرا اور نازنین کا تعلق۔ اس کی احتیاط پسندی کا اب تک وہی عالم تھا۔ البتہ اب اس نے مجھ سے چھینا اور میری ذمہ داریوں پہ چڑھا کر دیا تھا۔ وہ میری محبت کا جواب اس انداز میں تو نہیں دیتی تھی جس کا میں خواہاں تھا ہاں یہ ضرور تھا کہ اس نے مجھے میری محبت سمیت قبول کر لیا تھا۔ مجھے سامنے پا کے اس کی آنکھوں کی قد ملیں جل اٹھتی تھیں۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے اس کے لیے مجھ میں شبنم اتر آتی تھی۔ میں اس پہ سرور تھا..... اور مینو کی معصوم رفاقت میں گن۔ مینو کو میں نے اپنی پریم کہانی کا ایک اہم جزو تصور کر لیا تھا۔ اس سے وابستہ سارے فرائض اپنے سر لے لے تھے۔ اسے اسکول چھوڑنے جانا اسکول سے لانا آؤٹنگ کے لیے لے جانا۔ شاپنگ کے لیے لے جانا۔ اس کے فورٹ فلیورز کی آنکس کریم لے کر آنا۔ اس کا ہوم ورک کرانا۔ میری جیب میں گھر لوٹتے ہوئے ہمیشہ اس کے لیے چاکلیٹ اور پولو ہوتی۔ میرا قافار غ وقت اب اس سے

کو زائل کرنے کے لیے کہا۔ ”ایک تیرے دونوں شکار ہو سکتے ہیں۔ ادھر اس کی شادی ہوئی ادھر وہ آپ کی بہو بنی۔“

”یہ تو تب ہو گا ناں جب دو سال بعد تم لنڈورے لوٹو گے۔ اگر ساتھ میں چپاؤں بیاؤں کرنے والی کوئی جاپانی گنڈی ہوئی تو؟ زندگی کا کیا بھروسہ۔ آج ہم ہیں کل نہیں۔ روڈ میجر کیلینڈر دکھائیں گے ان بچپوں کے ماں باپ کو۔“

”اب آپ انتہائی جذباتی ماکاموں پہ اتر آئی ہیں۔ اس قسم کا نہ کوئی امکان ہے نہ ہو سکتا ہے۔“ پایا کی موجودگی کی وجہ سے لحاظ نہ ہوتا تو میں صاف صاف اعلان کر دیتا۔ ”میری زندگی میں نازنین کے علاوہ کسی کا تصور ہے نہ گنجائش۔ وہ میرے لیے کیا ہے آپ کو اندازہ ہوتا تو کبھی یہ بیکار اندیشے نہ پالتیں۔ اس کے آگے یہ جاپانی گڑیا انگلستانی میم اور امریکن باربی یہ سب کچھ بھی نہیں۔“ مگر کہا تو صرف اتنا ”آپ بے فکر ہیں۔ آپ کا عہد میرے لیے محترم ہے میں اس کا ہر حال میں پاس رکھوں گا۔“

اسے میں ناز بھی آگئی۔ پایا اور مادونوں کے چہرے ہی اسے باور کرا گئے کہ صورت حال گنیمیر ہے۔ میں بھی مینو کے کمرے سے واپس لوٹ رہا تھا ایک اور ناکام کوشش کر کے۔ میرے جانے کی خبر سن کے اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا اور تب سے بار بار کھٹکھٹانے کے باوجود بھی دروازہ نہیں کھول رہی تھی۔ ماما نے فوراً ہی ناز کو کو میرے جانے کی خبر سے لے کر مینو کے زبردست احتجاج تک سب بتا دیا۔ وہ گم صم صی صو نے پہ بیٹھی رہ گئی۔ حالانکہ جب اندر آئی تو کتنی بڑ جوش کتنی خوش لگ رہی تھی۔ شاید چار پانچ سالوں کی لڑکی محنت کے ختم ہونے کی خوشی تھی۔ شاید اپنی ماما کی خواہش پوری ہونے کا وقت قریب آنے کی خوشی تھی اور شاید اپنے مقصد کے نزدیک ترین پہنچنے کا جوش تھا جو ماما نے اسے یہ خبر سناتے ہی ٹھنڈا کر دیا۔ خود تو ماما مینو سے

دروازہ کھلوانے کی ایک اور کوشش کرنے چلی گئیں۔ پایا بھی کسی کام سے اٹھ گئے اور لاؤنج میں ہم دونوں رہ گئے۔ ایسی انتہائی کا موقع ناز کو کم ہی آنے دیتی تھی۔ ایسی جوبین قسمت سے پیدا ہو بھی جاتی تو وہ کھٹکے میں ایک منٹ بھی نہیں لگاتی تھی لیکن آج وہ بیٹھی رہی یا تو اسے اس کا خیال ہی نہ رہا یا اسے یہ احساس ہی نہ ہو سکا تھا کہ پایا اور مادونوں لاؤنج سے جا چکے ہیں۔ کیونکہ اپنی گود میں رکھے ہاتھوں پر نظریں جمائے وہ کسی گہری سوچ میں تھی یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جانتا ہی نہ چاہتی ہو۔ اس آخری امکان نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ میرے دل کو خوش فہم بنایا۔ میں اپنے صوفے سے اٹھ کے اس کے نزدیک آیا اور کارپٹ پر گھٹھوں کے بل اس کے پیروں کے پاس بیٹھ گیا۔

”ناز ڈیلیٹر پریشان مت ہو۔“

”پریشان نہ ہوں؟“ اس نے پلکیں اٹھا کے مجھے شام کی نظروں سے دیکھا اور نگہ کرتے ہوئے میرا سوال دہرایا۔

”پریشانی والی بات ہی تو ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ میں پریشان نہ ہوں۔“ اس کی کالی آنکھوں کے شفاف آئینے دھندلا گئے۔ اس نے گھٹی پلکیں تیزی سے جھپک کے اپنے امنڈتے ہوئے آنسو پرے دھکیلا چاہا۔

”پاگل لڑکی! اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے۔ تم نے سنا نہیں پایا نے کیا کیا ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے تو نہیں چار رہا۔ صرف دو سال کی تو بات ہے اور دو سال پلک جھپکنے میں گزر جائیں گے۔“

”صرف دو سال؟“ اس نے ”صرف“ پہ زور دے کر کہا ”تمہارے لیے یہ ”صرف“ دو سال ہوں گے۔ مجھ سے پوچھو یہ دو سال کیسے گزر رہیں گے۔“ اس نے اپنی ٹکٹ اپنی کمزوری تسلیم کی۔ یہ اس کا پہلا اعتراف تھا آنسوؤں سے بھیگا

اعتراف۔ محبت میں شکست تسلیم کر لینا ہی تو محبت کا اعتراف ہوتا ہے اور اس کے اس اعتراف نے مجھے اچانک مغرور بنا دیا۔ میں زمین پر بیٹھا تھا کسی ”داس“ کی طرح اس کے چروں میں..... لیکن ایک ہی ہل میں جیسے میں آسمانوں پر سنگھاسن جا بیٹھا۔
”ٹھیک کہتا ہوں۔ وقت کا کام تو گزرتا ہوتا ہے یہ کبھی نہیں رکا مگر یہ تو وقت گزرنے والے کو پتا ہوتا ہے کہ اس نے وقت کیسے گزارا۔ اس نے گزارا کیا..... یا وقت نے اسے گزار دیا۔“

”ارے رے..... میں گھبرا اٹھا“ اتنی مایوسی..... یا تم تو ابھی سے اتنی کمزور ثابت ہو رہی ہو۔ جب میں جانے لگوں گا تو تب تم.....“ وہ کسی خیال سے چونک کر میری بات کاٹ گئی۔

”کمزور تو میں ہوں صاعد بہت کمزور ہوں۔ تم جو اتنا بڑا بار میرے کانٹھوں پر ڈال کر جا رہے ہو اسے اٹھانے کے قابل نہیں ہوں میں۔ اگر دوبارہ اسے میرے اوپر ہی ڈالنا تھا تو اٹھا یا کیوں تھا؟“ وہ آنکھوں میں آنسو بھرے سوال کر رہی تھی۔ میں الجھ گیا۔

”تم نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ تمہارے جانے کا سن کر..... اُف صاعد تم کہتے.....“ وہ روپی پڑی۔ ہمیشہ اس کے آنسو دیکھ کے طول ہو جانے والا میں صاعد..... آج مطمئن ہو گیا۔ یہ آنسو اس کی محبت کو ظاہر کر رہے تھے۔ وہ محبت جو اسے مجھ سے تھی اور وہ محبت جسے وہ ہمیشہ چھپانے کی کوشش کرتا رہی۔ آج اس محبت کا کھل کے سامنے آ جانا میرے اندر رکون سی سکون بھرنے لگا۔

”سوچا تھا ناز و سوجا تھا مگر پھر خیال آیا کہ تم بھی یہ نہیں چاہو گی کہ میں اتنا اچھا موقع نہ آتا تھا۔ اچھا ہے۔ ایسی جاب میں ترقی کے چانسز بہت کم ہیں۔ ایسے میں

یہ آخر آنا میرے لیے نعمت سے کم نہیں تھا لیکن مجھے کیا پتا تھا تم میرے جانے کو اتنا سہیلی لوگی اور میرے جانے کی خبر تم پر یوں اثر کرے گی۔ اس کا یہ اچھوتا اظہار رحمت مجھے ہواؤں میں اڑا رہا تھا۔ میں ہل بھر میں دنیا کا سب سے امیر سب سے آسودہ سب سے خوش قسمت شخص بن گیا تھا۔ جو اس ابھی ابھی نازو نے مجھے بخشا تھا اس کے آگے یہ معمولی ترقی تو کچھ بھی نہیں تھی۔ جو وہ مجھے دے رہی تھی اس کے آگے تو سب بچ تھا۔ میں نے فوراً ہی یہ سب ٹھکرانے کا فیصلہ کر لیا۔

”لیکن نازو تم سے بڑھ کے کچھ بھی نہیں ہے۔ اب بھی اگر تم کہو تو میں.....“ میں اپنی رو میں کہتا جا رہا تھا اس کے چہرے پر پھنٹلائی ہوئی سی حیرانی پر غور کیے بغیر۔
”میں اپنی نہیں مینو کی بات کر رہی ہوں صاعد۔“ اس نے مجھے آسان سے زمین پر نہیں بٹھا تھا بلکہ میرے پیروں کے نیچے سے زمین بھی کھینچ لی تھی۔

”تم نے اس کے بارے میں سوچا تک نہیں۔ کاش تم اسے خود سے اتنا بچ نہ کرتے۔ وہ تمہاری عادی ہو چکی ہے، بہت کلوز ہو چکی ہے تم سے۔ اب وہ بہت ڈسٹرب ہو جائے گی، بہت سی پراپلر کری ایٹ کرے گی۔ میں..... میں اکیلی کیا کروں گی صاعد۔“

میں اب تک فضا میں معلق تھا اور وہ نہ جانے کیا کچھ کہتی جا رہی تھی۔ اسے میری ہل ہل بھتی آ نکھیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ میرا دھواں دھواں ہوتا چہرہ میرا نوافلجہ..... کچھ بھی نہیں۔ نظر آ رہی تھی تو صرف مینو۔ اس کی بہن زمین۔

”میں سمجھا دوں گا اسے، فکر مت کر۔“ بہت دقت کے بعد میں صرف اتنا کہنے کے قابل ہو سکا اور اپنے تھکے ماندے قدم گھٹیت کے وہاں سے چل دیا۔ اسے تسلی دے تو دی تھی مگر بچی بات تو یہ تھی کہ میں اس دقت مینو کا سامنا تک کرنے کا رواں دواں ہوں۔

تھا۔ اگر میں نازو سے شاکی تھا تو مینو سے نکالوں۔ وہ کیوں ہر بار مجھ سے آگے نکل جاتی ہے؟ آخر کب تک وہ نازو کے لیے غبرون رہے گی؟ کب تک اس کے وجود کے پیچھے میرا وجود چھپا رہے گا؟ کب میں نازو کی نظروں میں آؤں گا؟ کب آئے گی میری باری؟ شاید کبھی نہیں۔ مینو کے ہوتے ہوئے تو کبھی نہیں! اکی، موجودگی میں نازو کی اور کو اپنی زندگی میں اپنے دل میں آنے ہی نہ دے گی۔ میں اسی طرح غصہ کروں گا۔ بچھے دل کے ساتھ میں پیٹنگ میں مصروف ہو گیا۔ اگلے دو دن تک میں نے نہ تو مینو سے ملنے کی زحمت کرنا گوارا کی نہ ہی کسی سے اس کے بارے میں پوچھا۔ اس بات کو زیادہ محسوس اس لیے نہیں کیا گیا کہ ان دونوں میری مصروفیات بڑھ چکی تھیں۔ میرے قدم گھر میں نکلتے ہی نہ تھے۔ کبھی دوستوں کی جانب سے دی گئی پارٹیز میں شرکت، کبھی شاہنگ، کبھی عزیز رشتے داروں سے ملاقاتیں۔ اس دوران ماما نے میری اور نازنین کی شادی کا ذکر بھی چھیڑنا چاہا جو پاپا کی دونوں مخالفت کی وجہ سے دب گیا۔ مجھے اس ذکر سے دلچسپی اس لیے نہ ہوئی کہ شادی ہوتی یا نہ ہوتی، دونوں صورتوں میں مجھے اکیلے ہی جانا تھا۔

تیسرے دن میں اپنا انکٹ کفرم کر کے آنے کے بعد اپنی پیٹنگ کا از سر نو جائزہ لے رہا تھا جب مینو آئی۔ دل ہی دل میں اس سے ناراض ہونے کے باوجود اچانک اسے سامنے پا کے میں خفت اور پشیمانی کے احساس سے دوچار ہو گیا۔ جس سے ناراضی ہونا چاہیے تھی اس کے بارے میں میرا دل ہمیشہ فراخ ولی دکھا جاتا تھا اور وہ..... وہ معصوم جس کا اس سارے قصے میں کوئی تصور نہ تھا وہ یوں زیرِ عتاب آئی کہ میں نے دو تین دن سے اس کی خبر تک نہ لی۔ حالانکہ اس وقت اسے میری ڈھارس کی ضرورت تھی۔

”صاعد بھیا!“ اس کی آواز میں میرے لیے کوئی ناراضی نہ تھی۔ یہ بھی باعثِ حیرت تھا وہ نہ ذرا سا بھی اگور ہو تا وہ برداشت نہیں کرتی تھی۔

”آپ مجھ سے غنا ہیں؟“ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہ میرے پاس آئی۔ میں چونک گیا بھلا یہ راز اسے کس نے بتایا ہو گا۔

”کیوں؟ تم سے کس نے کہا؟“

”بیانے۔“

”کیا..... کیا کہا تمہاری بیانے؟“ مجھے خدشہ ہوا کہ نازو یہ بات بھانپ تو نہیں گئی کہ میں اس دن والے واقعے کو دل پہ لینے کے بعد مینو سے کھج گیا ہوں۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا کہ میں اس پہ اپنی عقلی ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ یہ میرا حق تھا۔ میں دو سال کے لیے اس سے دور جا رہا تھا اور وہ بھی کہ اس کے پاس میرے لیے ایک بھی اچھی سی بات نہیں تھی، کوئی انتظار کا بھنگو نہیں تھا۔ اگر اس نے کچھ کہا بھی تو اپنے نہیں بلکہ کسی دوسرے کے حوالے سے۔ کیا میں اس بات پہ ناراض نہ ہوتا؟ مگر میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے پتا چلے کہ اس سے بے پایاں محبت کرنے کا دعویٰ کرنے والا اور اس کی خاطر کچھ بھی کر گزرنے کا حوصلہ رکھنے والا صاعد اندر سے اتنے چھوٹے کا دل کا مالک ہے اتنا کم ظرف ہے کہ ایک بچی سے کیڑہ رکھ کے بیٹھ گیا۔

”بھئی کد آپ مجھ سے اس لیے ناراض ہیں کہ میں آپ کی کامیابی پہ خوش ہونے کے بجائے دل چھوٹا کر کے بیٹھ گئی اور یہ بھی کہ آپ کم ہمت لوگوں سے دوستی نہیں کرتے اور یہ کہ.....“

”بس بس بس.....“ میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کے اسے اور کچھ کہنے سے روکا۔

تمہاری پیامیرے دل کی باتیں کیا جانے۔ اسے یہ ہنر کب آتا ہے۔ اس لیے اس کی

باتوں پہ کان مت دھرو۔ وہ نہ مجھے سمجھ سکتی ہے نہ میری ناراضیوں کو۔“ میں اداس ہو گیا پھر اس کی حیران آنکھوں کو پھیلنے دیکھ کے مسکرایا۔

”اصل بات یہ ہے کہ میں تم سے ڈر رہا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں یہ جنگلی مٹی بچے تیز کر کے میرے پیچھے ہی نہ پڑ جائے۔ نہ بابا نہ..... جب تم غصے میں ہوتی ہو تب تمہارا سامنا کرنا خطرے سے خالی نہیں۔“

”کوئی نہیں جی، میں کوئی اتنی بدتمیز ہوں۔ ہاں مجھے غصہ تو تھا..... لیکن صرف اس بات پہ کہ آپ آخر کیوں جا رہے ہیں۔ کیوں؟ لیکن بیانے سمجھا دیا ہے آپ کا جانا ضروری ہے اور مجھے.....“ اسے شاید ایک بار پھر رون آ گیا تھا۔ اس لیے بات ادھوری چھوڑ کے سر جھکا کر رہ گئی۔ ایسے میں مجھے اس پہ بے تحاشا پیار آیا۔ میں نے بتایا تھا ناں کہ وہ تھی ہی اتنی پیاری اور من موہنی سی کہ کوئی اس سے زیادہ دیر تک ناراض رہ ہی نہ پاتا تھا۔ ایسے میں اپنے دل میں میل رکھتا تو کسی طرح؟ بلکہ مجھے اپنے پچھلے خیالات پہ شرمندگی ہوئی۔

”کس قدر کمینہ شخص ہوں میں! اتنی چھوٹی سی بچی سے عداوت! ایسی نفسی روح سے رقابت؟“ میں صوفی پہ بیٹھ گیا اور دونوں بازو دوڑا کر کے اسے اشارہ کیا مگر وہ ہمیشہ کی طرح دوڑ کے میرے گلے لگنے کے بجائے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آگے بڑھنے لگی۔ میں نے غور کیا کہ جب سے وہ اندر آئی تھی اس کے ہاتھ پیچھے کی جانب سیدھے تھے۔ گول مثلث سے صحت مند رخسار والے چہرے پہ دبی دبی مسکراہٹ یہ راز کھول رہی تھی کہ وہ مجھ سے کیا چھپا رہی ہے۔

”ہوں اوں“ میں نے سر ہلایا ”سر پر از گشت؟“

”لیں..... اور اسے آپ جاپان جانے کے بعد کھولیں گے۔“ اس نے ایک بڑا

سایکٹ میرے کھلے ہوئے اٹیچی کیس میں رکھ دیا اور ہنگامی کھڑکی کر کے تاکید کی۔
”دیکھیں نوجوانک..... مجھے پتا ہے آپ سے سسٹن بالکل بھی برداشت نہیں ہوتا لیکن پلیز! اسے ابھی مت کھولے گا۔“

”او کے پائزر اپراس..... مگر اس میں کیا کچھ بھر ڈالا ہے؟“

”اچھا اچھا اب آپ بہانے سے مجھ سے اٹھوانے کی کوشش مت کریں۔ میں اتنی بے وقوف نہیں رہی ہوں گی ہوں۔“

”اوہو..... ایمرنگ..... بریکنگ نیوز ہے یہ تو۔“ میں نے صاف صاف مذاق اڑایا۔ بارہ تیرہ برس کی تھی وہ مگر نوں سال سے زیادہ کی ننگی تھی۔ فزیک ہی ایسی تھی گول پھولے پھولے پھولے گالوں والا بچکانہ سا چہرہ۔ ننھے منوں والی بھولی بھالی مسکراہٹ نرم سی باریک آواز اور قد بھی تو نہیں بڑھ رہا تھا۔ اس کو بھی ماما سراسر میرا قصور قرار دیتی تھیں۔

”ابھی تک تو تم گودوں میں اٹھا اٹھا کے پھرتے ہو۔ جن بچوں کو گود میں بٹھایا جائے ان کا قد بڑھنا رک جاتا ہے یہ ہمارے بڑے کہہ گئے ہیں۔ دیکھو بھلا شائستہ کی پوتی اس سے ڈیڑھ سال چھوٹی ہے مگر اس سے کھٹا ہوا قد ہے۔“

”اچھو نکلی اس میں ایک نہیں، تین گفٹس ہیں اور آپ کو بتانا ہے کہ آپ کو اس میں سے سب سے اچھا کون سا لگتا ہے۔“ ہاتھ خالی ہوئے تو وہ فوراً میرے گلے پر بیٹھ گئی۔

”ابھی بتاؤں؟“ میں فوراً تیار ہو گیا۔

”جی نہیں۔“ وہ چیخی ”دیکھنا ناں! آپ مجھے فول بتانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ میں ہنسنے لگا۔ وائٹ ٹراؤزر جس پہ بڑے بڑے میروں گلاب کے پھول تھے اور

میرون کھلی سی شرت میں وہ کوئی ڈول ہی لگ رہی تھی۔ تب میں بے اختیار اس کا ماتھا چوم بیٹھا۔ پہلی بار میرا دل اداس ہونے لگا یہ سوچ کر کہ میں گھر سے اور اپنے پیاروں سے دور جا رہا ہوں۔

نازنین سے مینو کو سمجھانے کا وعدہ بھی لیا تھا اس لیے اسے لمبی چوڑی بھیجتی کہیں کہ اسے میری غیر موجودگی میں اپنی پیا کو بالکل بھی تنگ نہیں کرنا اچھی بیٹی بن کے رہنا ہے۔ بچے پر اس کرتے ہوئے مینو نے جواباً مجھے لمبی چوڑی فرمائیں گناہیں جو میں نے نوٹ کر لیں۔



میں نازنین سے ناراض تھا۔ ناراض ہی گیا..... مگر وہاں جا کے یہ ناراضی خود بخود دور ہو گئی۔ اس پہ اداسی کا رنگ غالب آ گیا تھا۔ کچھ بھی تھا چاہے وہ مجھ سے کئی کتراتی تھی مجھے سے اکیلے میں بات تک کرنا پسند نہیں کرتی تھی مگر ہم ایک چھت کے نیچے تو رہتے تھے۔ محبت کرنے والوں کے لیے یہ احساس بھی کتنا خوش کن ہوتا ہے۔ میں تو اس فضا میں سانس بھی کسی حیرت کی چیز کی طرح اپنے اندر اتارتا تھا جس فضا میں وہ سانس لیتی تھی۔ اس کا چہرہ تو صبح شام نظر آتا تھا۔ ارے ہاں چہرہ تو یہاں بھی نظر آتا ہے۔ وہ جو مینو نے سر پر انز گفٹ بلکہ گفٹ دیے تھے ان میں سے ایک نازنین کی خوب صورت فریم شدہ تصویر بھی تو تھی۔

”ارے میری مینو گڑیا اب تو یقین کرنا ہی پڑے گا کہ تم واقعی بڑی ہو گئی ہو۔“ میں نے میٹ پہ چیلنگ کرتے ہوئے اسے کہا۔ مجھے اس کا تحفہ دینے کا یہ اعزاز پسند آیا تھا۔

”اوہ تو تمہارا خیال ہے میں چھوٹا ہو گیا ہوں، اب اس بد شکل کی ضرورت مجھے ہے۔“

”پلیز..... پلیز..... میرے کیوٹی سے بھلو کو کچھ مت کہنا اور میں جانتی ہوں آپ چھوٹے نہیں مگر گھر سے دور تو ہیں۔ بلیوٹی میرے بھلو کو گلے سے لگا کے تسلی دینا اور پیار سے سلاتا بہت اچھی طرح آتا ہے۔ نئے ملک میں نئے گھر میں شروع شروع میں آپ کو نیند نہیں آئے گی۔ ہم سب یاد بھی بہت آئیں گے۔ ایسے میں یہ پنک میٹھر ہی آپ کو مسلائے گا۔ آزمائش شرط ہے۔“

اس کا جواب پڑھ کے میں سن رہ گیا۔ کہنے کو یہ ذرا سی بات تھی۔ اس نے اپنا ایک عام سا کھلونا ہی مجھے دیا تھا مگر میں ہی جانتا تھا یہ اس کے لیے معمولی کھلونا نہ تھا۔ وہ بچپن کے بارہ سال سے اسے بازوؤں میں بھر کے سونے کی عادی تھی۔ گہری نیند کے دوران بھی اسے اس کے بازوؤں سے نکال لیا جاتا تو وہ ہڑبڑاکے جاگ جاتی تھی۔ پتا نہیں اس نے اپنی کتنی راتوں کی نیند پر باد کے مجھے یہ سونات دی تھی اور اس کی وجہ کتنی اچھوتی تھی۔ کوئی سننے تو ہنس پڑے کسی معصوم بچی کی حماقت یا سادگی جان کے..... مگر کچھ تو اس میں کتنی گہرائی تھی۔

”کہاں گم ہیں آپ؟ کیا سو گئے؟“ دوسری بار اسکرین پر دکھا آیا۔

”ہاں سو گیا تھا تمہارا کیوٹی ہٹکے لوری گا کے سنائی۔“

”میرے بھلو کا مذاق مت اڑائیں اور میرے سوال کا جواب دیں آپ کو کیا چیز سب سے اچھی لگی؟“ وہ اپنے سوال کا جواب جاننے پر مصر تھی۔

”کارڈز اچھے تھے۔ تصویر بھی اچھی تھی۔ نہیں میرا خیال ہے تصویر زیادہ اچھی

تھی۔“

”اور وہ آپ کا پراس؟ آپ نے کہا تھا تاں کہ آپ مجھے بتائیں گے آپ کو سب سے اچھا کھٹ کون سا لگا؟“ اس نے لکھ بیجا۔ اس بڑے سے پیکٹ میں سب سے اوپر وہ پنک میٹھر رکھا تھا جو بنو کو بہت عزیز تھا۔ بچپن سے وہ اسے اپنے ساتھ بھیج کر سونے کی عادی تھی۔ اس کی ماما نے بہت کوشش کی یہ عادت چھڑانے کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ حتیٰ کہ اگر وہ کسی کے ہاں رات رکتی تو دیگر سامان کے ساتھ بنی کا یہ اسٹنڈ ٹوٹے بھی رکھنا پڑتا جس کے بغیر وہ سونے پر تیار نہ ہوتی تھی۔ ہمارے گھر بھی یہ پنک میٹھر اس کے ساتھ چلا آیا جو کبھی ادھر ادھر ہو جاتا تو میوزمیں آسمان ایک کر دیتی تھی۔ نازد اس بات کا خاص دھیان رکھتی تھی کیونکہ پنک میٹھر ہی اس کی ”نیند“ تھا اور اب وہ میرے ساتھ جاپان میں تھا۔ میں حیرت زدہ سا اسے ہاتھ میں لیے کھڑا رہا۔ اسے مجھے دینے کا بھلا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ کیا وہ اسے گلے سے لگائے بغیر سو جائے گی؟ اس کے نیچے لٹاف تھا۔ میں نے اٹھایا تو اس میں سے ایسے بہت سے رنگ برنگ گریٹنگ کارڈز نکل کے بکھر گئے جو شاید منونے اپنے ہاتھ سے بنائے تھے۔ کوئی ”آئی مس یو“ کا..... کوئی ”یو ای گین“ کا اور سب سے نیچے وہ فریم پڑا تھا جسے اٹھا کے میں نے پلٹا تو رنگ برنگ میرا سر دگر دھکیل گئے۔ وہ نازنین کی ایک خوب صورت تصویر تھی۔ میں نے اسے اپنے سگنل بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر سجا دیا۔ پنک میٹھر کو تھکے کے ساتھ ایک لگا کے بٹھایا اور وہ درجن بھر کارڈز سامنے والی دیوار پر چپاں کر دیئے۔ میرا ڈیزہ کرے کا ڈیزا بنما فلٹ ج سا گیا اور اب وہ پوچھ رہی تھی مجھ سے کہ سونے کی چیز پسند آئی۔

”پہلے تم یہ بتاؤ تم نے مجھے اپنا پنک میٹھر کیوں دیا؟ اب تم کیسے سوؤ گی؟“

”سو جاؤں گی۔ آپ نے ابھی مانا ہے کہ میں بڑی ہو گئی ہوں۔“

”مجھے پتا تھا۔ یہی کہیں گے آپ۔“

”پوری بات تو سن لو پارٹنر..... اور وہ یہ کہ ان دونوں سے بھی اچھا تھا تمہارا پینک پلٹھر۔“ یہ جواب میں نے اس کا دل رکھنے کو نہیں دیا تھا بلکہ پوری سچائی سے کہا تھا۔

”کوئی نہیں جی۔“ آپ ایسے ہی کہہ رہے ہیں۔ میں جانتی ہوں آپ کو سب سے زیادہ بیا کی فوٹو والا گفٹ پسند آیا ہوگا اور آنا بھی چاہیے ورنہ میں بیا کو بتا دوں گی۔ وہ آپ کی سگریٹ والی بات.....“

”اچھی دھونس ہے۔“ اب تم بلیک میلنگ پہ اتر آئی ہو۔ بھئی کوئی زبردستی ہے کیا؟ مجھے جو اچھا لگے گا اسی کا نام لوں گا۔“

”مگر بیا کی فوٹو والا گفٹ زیادہ اچھا ہے۔“ وہ اپنی بات پہ اڑ گئی۔ ”آپ کو کوئی دوسری چیز اس سے زیادہ بہتر کیسے لگ سکتی ہے۔“

”اس لیے کہ نیچرل سی بات ہے۔ جو نیند اڑائے گا وہ اچھا لگے گا نیند لانے والا؟“ ظاہر ہے نیند لانے والا۔“

”میں کبھی نہیں۔“

”کبھی بھی نہیں۔ اس لیے کہ تم ابھی ”اتنی“ بھی بڑی نہیں ہوئیں۔“

یہ جا پاؤں آنے کے بعد دوسرے یا شاید تیسرے دن کی بات ہے جب میں نے اس سے پہلی بار نیٹ پہ چٹنگ کی تھی۔ اس کے بعد یہ ہمارا معمول بن گیا۔ حالانکہ ماما سے فون پہ بات ہوئی تو انہوں نے بتایا تھا کہ مینو خاصی پیار ہے۔ اس کا بخار اترتا ہی نہیں۔ اس کے باوجود وہ روز باقاعدگی سے آن لائن ہوتی۔ میں پوچھتا تو مکر جاتی۔

”میں کب پیار ہوں۔ آئی ٹی بھی بس۔“

”تمہاری اس پینڈو بیا کو کمپیوٹر آپریٹ کرنا آیا نہیں؟“ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ

فون پہ نہیں تو کم از کم نیٹ کے ذریعے ہی مجھ سے رابطہ رکھے لیکن اسے کبھی بھی کمپیوٹر سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔

”کہاں..... وہ وہ اپنی باؤس جاب میں بڑی ہیں۔ ٹائم ملے تو بیا سو گز اترتی ہیں یا پھر میرے ساتھ لوڈ کھیل کے۔ آئی نے انہیں کچن میں جانے سے بھی منع کر دیا ہے۔ وہ اتنی تھکی جوتی ہیں۔“

میرا کورس ختم ہونے میں بس دو ماہ رہ گئے تھے۔ اب نازمین سے ملنے کی ہڑک زیادہ ہونے لگی تھی۔ ماما نے تو میری واپسی سے پہلے ہی میری شادی کی تیاریاں بھی شروع کر دی تھیں۔ ایک دن اتفاقاً وہ مجھے پاپ ”میسر“ آ گئی۔

”جی میں ٹھیک ہوں۔ ہولڈ کر دو آئی کو باتیں ہوں۔“ وہ ایک آدھ عام سی بات کے بعد ہی رفو چکر ہونا چاہتی تھی کہ میں نے روک لیا۔

”پہلے میرے ایک سوال کا جواب دو۔ مجھے یاد کرتی ہو؟“ بڑی آس سے میں نے پوچھا تھا۔

”ہوں کرتی ہوں۔“ بڑی مددگرمی آواز آئی۔ میں نے سکون بھرا سانس لیا۔ ورنہ اس سے کیا بعد تھا کہ دینی وقت ہی نہیں ملتا کہ میں کو یاد کرنے کا۔

”کتنا یاد کرتی ہوں؟“

”یہ کیا سوال ہوا؟“ اس کی مددگرمی ابھی میرے آس پاس کھنکی ”بس کرتی ہوں..... کتنا؟“ مینو سے تو کم ہی کرتی ہوں۔“ یہ جواب مجھے بہت عجیب اور بے محل سا لگا۔

”مینو کے یاد کرنے میں اور تمہارے یاد کرنے میں کچھ تو فرق ہوگا؟“ میں نے اسے اپنے اور اس کے رشتے کی نوعیت کا احساس دلانا چاہا جو اس بات کا متقاضی تھا

کہ اس کے میرے لیے جذبات میتو سے الگ ہوتے، منفرد ہوتے۔
 ”کوئی ایسا ویسا فرق؟ بہت فرق ہے۔ جتنا وہ تمہیں یاد کرتی ہے اس کے
 مقابلے میں تو کیا کوئی بھی تمہیں یاد نہیں کر سکتا۔“
 اس کی اس بات نے مجھے اتنا دل برداشتہ کیا کہ میں نے لائن ہی ڈس کنیکٹ کر
 دی۔ میں دل میں غبار لے کے وہاں سے چلا تھا۔ اس سے دوری کے احساس نے اس
 غبار کو ہلکا ضرور کیا تھا لیکن اب وطن واپس لوٹتے ہوئے یہی غبار دوبارہ میرے دل پہ
 چھایا ہوا تھا۔ جس کی وجہ صرف اور صرف وہ تھی۔



سب کو اندازہ تو تھا کہ میں اسی ماہ واپس لوٹ آؤں گا مگر میں جان بوجھ کر
 انہیں کفرم ڈیٹ نہیں بتا رہا تھا بلکہ یہ تاثر دے رہا تھا جیسے کسی ضروری کام کی وجہ سے
 مجھے ابھی چند ہفتے اور رکنا پڑے گا۔ دراصل میں اچانک گھر آ کے سب کو سر پر انداز دینا
 چاہتا تھا اور میں نے یہی کیا۔

اداکل اپریل کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ ابھی سورج کی حدت پھیلی نہیں تھی۔ اس
 لیے موٹے کی خوشبو میں رچی بسی ہوا بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ ورنہ تو لاہور میں اپریل
 سے پہلے پہلے گرمیاں آن موجود ہوتی ہیں۔ ٹیکسی سے اتر کے میں نے موٹے کی اس
 خوشبو کو ایک طویل سانس لے کر اپنے اندر بھرنا چاہا۔ اس خوشبو میں اپنا پن اس لیے تھا
 کہ یہ میرے ہی گھر کے آنگن سے آ رہی تھی۔ دیکھی موٹے کا یہ پودامیری دادی جان
 کے ہاتھ کا لگا ہوا تھا اور جب ان کی وفات کے بعد ہماری گورنوالہ آبائی مکان بکا تو
 ماما بس پودے کو اکھاڑ کے اپنے ساتھ لے آئی تھیں۔

”آج کل کے مویے میں یہ خوشبو کہاں جو اس میں ہے۔ چند سیکنڈ کے لیے منہ میں بھر لو تو سارا دن ہتھیلی سے مہک نہیں چھوٹی۔ آج کل تو کاغذی موتیا اگایا جا رہا ہے۔ صبح گھر سے نکلے ہوئے یہ خوشبو گویا محسوسات ہے سوار ہو کے ہمراہ ہو جاتی تھی۔ نازو آئی تو یہ خوشبو گھر کے باہر لان میں ہی نہیں بلکہ گھر کے اندر تک پہنچ گئی۔ وہ مٹی کی پیالی میں صبح صبح مویے کی کلیاں بھر کے لاؤنج میں رکھ دیتی تھی۔ جہاں سے وہ شام تک مہک بکھیرا کرتیں۔ ہمارے گھر کو کسی انٹر فیکٹر کی ضرورت نہ رہی تھی۔ نازو..... نازنین..... پتا نہیں میرا دل بہانے بہانے سے ہر بات میں اس کا ذکر کیوں لے آتا ہے۔ میں نے قدم آگے بڑھائے۔ مین گیٹ سے جھانک کر اندر کا جائزہ لینے کے لیے میں نے پتے اچکا کے دیکھا۔ عرصے بعد اپنے گھر کا آنگن دیکھنے سے دل و نظر کو جو آسودگی اور طمانیت حاصل ہوتی ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو اس تجربے سے گزر چکے ہوں۔ اسی احساس نے میرے لبوں پہ ایک بے ساختہ سی مسکراہٹ پھیلادی۔ لان میں لگے المٹاس اور سنبھل کے میز پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ المٹاس کے پیلے پیلے گچھے..... جیسے مایوں کی لہجہ نے گہنے لٹکار رکھے ہوں اور سنبھل کے سرخ بڑے بڑے پھول جن کا ایک بڑا سا ڈھیر نیچے نیچے گھاس پہ بھی لگا ہوا تھا۔ جاسن اور آم کے درختوں پہ ہلکا سا بورا تر آیا تھا۔ البتہ لیوں کا پودا بڑا ویران ویران سا نظر آیا۔ چند ایک کچے ہرے لمبوؤں کے علاوہ اور کوئی لیوں نہ تھا۔

”گلتا ہے آج کل میں ہی ماما نے لیوں کا چارڈالا ہے۔“ میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ پورٹیکو میں اور انٹریس ڈور کے پاس لگی لائیں اب تک آن تھیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی تک کوئی باہر نہیں نکلا۔ سب سے پہلے پایا نماز کے لیے نکلا کرتے تھے اور ایسے میں وہ مین گیٹ ان لاک کر جاتے تھے۔ اندر داخلے ڈور کی ڈبلی

ات پالی ان کے پاس ہوتی تھی اور جو ایک میرے پاس بھی رکھی تھی جسے میں اس وقت اس لیے استعمال نہیں کر سکتا تھا کہ مین گیٹ پہ اب تک دودھ تالے لگے ہوئے تھے۔ میرا سر پر انڈر دینے کا پروگرام دھڑکے کا دھڑکا گیا۔ آخر کار وہاں دس منٹ تک لڑنے کھڑے جائزہ لینے کے بعد میرا ہاتھ کال تیل کی طرف گیا۔ اتنے میں میں نے انہیں آف ہوتے دیکھیں۔

”گلتا ہے پایا باہر آ رہے ہیں۔ اوکے..... ناٹ بیڈ ان کو اپنے سر پر انڈر میں شامل کر لیتا ہوں۔“ میں دونوں ہاتھ گیٹ کے جھنگے پر جما کے کچھ اور اوپر ہوتا کہ اندر سے اتے پایا کو صاف نظر آسکوں مگر دروازے سے میں نے جسے باہر نکلتے دیکھا وہ پایا نہیں کوئی اور تھا۔

”نازنین!“ میرا دل نے ایک ہیٹ مس کی مگر وہ ناز نہیں تھی۔ اسے میں نے کبھی بھی جا لنگ سوٹ میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ جو بھی تھی اب میری جانب پشت کیے اپنے شانوں کے شہدرنگے بال بربرینڈ میں سمیٹ رہی تھی اور نازو کے بال تو لمبے تھے لہرے سیاہ تھے۔ پھر یہ کون ہے؟ میں نے گھبرا کے گردن گھمائی اور اپنے گھر کا نمبر اور نیم پینٹ دوبارہ پڑھی۔ ”کہیں میں کسی اور گھر میں تو داخل نہیں ہو گیا۔“ ایک فضول سا خیال میرے ذہن میں آیا اور مجھے خود ہی اس حماقت پہ ہنسی آگئی۔ دوبارہ نظر وہاں ڈالی تو وہ اب نیچے نیچے ایک گھٹنا زمین پہ ٹیکے اور دوسرے گھٹنے پہ ٹھوڑی جمائے اپنے لہوؤں شوز کے تسمے کس رہی تھی۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی جیسے وہ سیدھی ہوئی اس کی نظر مجھ پہ پڑی اور ایک ہلکی سی چیخ اس کے لبوں سے آزاد ہوئی اور ایک چیخ بننے لگی۔

صبح کی اولین ساعتوں میں، ملکجے سے اجالے میں کسی کو گھر میں جھانکتے دیکھ کر

گھبرا جانا فطری سی بات تھی اور اس کے ردِ عمل میں اس کا چہرنا بھی سمجھ میں آتا ہے مگر میری چیخ خود میری سمجھ سے باہر تھی۔ یہ اصل میں اس کو پہچاننے میں کامیاب ہو جانے کی خوشی میں ماری جانے والی چیخ تھی..... یا پھر..... اس کو پہچان کر بھی یقین نہ کرنے کے اظہار کے طور پر تھی۔
وہ مینو تھی..... زمین محمود۔

”صاعد بھیا!“ گھبرا کے پلٹنے سے پہلے پہلے وہ بھی مجھے پہچان گئی تھی اور اب دوڑ کے میرے پاس آ رہی تھی۔ چند قدموں کا فاصلہ اس نے درجن بھر چیخوں کے ساتھ طے کیا۔ اب اس کی چیخیں میرے آنے کی خوشی میں تھیں۔ میرے سارے سر پر انز کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا اس لڑکی نے۔

مگر ابھی بہت سے اور سر پر انز میرے منتظر تھے!



”کیا تمہیں پتا تھا میں آج آنے والا ہوں؟“ میں نے مینو سے پوچھا۔
”جی ہاں، نہیں..... میں تو جا کنگ کرنے نکلی تھی۔“
”جا کنگ..... اور تم؟ تم تو جس جگہ بیٹھ جاؤ، ہلتی بھی مشکل سے ہو..... پھر یہ جا کنگ؟“ میں حیران ہوا وہ جھینپ گئی۔
”کوئی نہیں جی.....“ وہی اس کا مخصوص فقرہ وہی پرانی زور سے سر ہلا کے نفی کرنے کی عادت۔ اب وہ مجھے جانی پہچانی سی لگی ورنہ ڈھونڈنے سے بھی میں اس میں دو سال پہلے والی کوئی بات نہیں پار ہوتا تھا۔

اتنے میں نازو اپنے کمرے سے نکلتی دکھائی دی۔ وہ شاید صبح کی نماز پڑھنے کے بعد سیڑھی بمیں آ رہی تھی میرے آنے کی خبر سن کر۔ اس کا سفید کروشے کی بیل والا دوپٹا اس کے گرد بالکل نماز پڑھنے والے انداز میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کا سارا سرنیال اور رخساروں کا ایک حصہ اس کے دوپٹے میں چھپا ہوا تھا اور باقی چہرے پر دوپٹے کے

کناروں پر لگی کرڈیہ کی نیل کے سائے جھلک رہے تھے۔ وہ بالکل ویسی ہی تھی۔ اتنی ہی حسین اتنی ہی باوقار اور..... اور اتنی ہی سرد۔

آج بھی اس کے انداز میں میرے لیے کوئی وارنگی، کوئی دالہا نہ پن نہیں تھا حالانکہ میں پورے دو سال بعد اس کے زور و تھا۔ ہاں وہ خوش تھی مگر میں جانتا تھا یہ خوشی ویسی ہی خوش تھی، جیسی خوشی اس گھر کے کسی بھی دوسرے فرد کے دلچسپ لوٹنے پر ہوتی۔ اس خوشی میں ایسا کوئی اظہار نہ تھا جو مجھے اجیشل بناتا۔ اسے سامنے پا کے میرے سرد ہوتے وجود میں جو پھر سے ایک چٹکاری بھڑکتی تھی وہ اس کے عام سے روپنے نے نبھا کے رکھ دی۔

”اف“ میں بتا نہیں سکتی میں آج کتنی خوش ہوں۔“ مجھے آئے میں منٹ ہی ہوئے تھے اور ان میں منٹوں میں مینو نے بلاشبہ بیسویں مرتبہ یہ فقرہ ادا کیا۔

”بیٹا، تمہیں بتانے کی ضرورت بھی نہیں کہ تم کتنی خوش ہو۔ یہ تمہیں دیکھ کے بھی معلوم کیا جاسکتا ہے۔“ پاپا نے اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔ واقعی خوشی اس وقت کرفوں کی طرح اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اس کی بلوریں آنکھیں ہیرے کی کئی جیسی دھمک رہی تھی اور اس کی آواز میں چٹکاریں ٹھک رہی تھیں۔

”صاحب بھیا کے لیے ناشتا میں تیار کروں گی۔“ اس نے یہ اعلان کر کے مجھے اور بھی حیران کیا۔

”ارے..... تمہیں ناشتا بنانا آگیا؟“

”یوں کہو کہ تمہیں اغلا ابا لانا“ توں پر جیم لگانا اور کپ میں چائے کس کرنا آگیا؟“ نازنین نے ہنستے ہوئے چوٹ کی اور اس کی ”صلاحتوں“ کی تفصیل بیان کی۔

”بس تو پھر میں آج مینو کے ہاتھ کا بلا ہوا اغلا اور اسی کے ہاتھوں سے توں پر جیم لگوا کے کھاؤں گا۔“

”اور وہ جو نازنین پوریوں کے لیے میدہ گوندھ کے آئی ہے، تمہیں حلو بھوننے کی خوشبو نہیں آ رہی؟“ مانا نے اس کی کارکردگی گنوائی، تب مجھے احساس ہوا کہ وہ پچھلے چندہ منٹ سے بچکن میں کیا رہی ہے۔ میں جود ہی دل میں اس کے اٹھ کر جانے پر خفا تھا، اب مطمئن ہو گیا۔ ”اسے اب بھی میری پسند کا خیال ہے۔“ یہ احساس ڈوبتے ہوئے دل کو تقویت دے رہا تھا اور ایسا سوچتے ہوئے میں نے مینو کے پچھلے پڑتے چہرے کو بہت سرسری سادیکھا۔

میرے آنے کی خبر سن کے اگلے ہی دن صائم بھائی جان بھی اپنی فیملی کے ساتھ آ گئے۔ مانا کی صحت اب اس قابل نہیں رہی تھی کہ وہ عملی طور پر گھر کے کسی کام میں زیادہ حصہ لے سکیں۔ ردو اب بھائی کو اب خیر سے ”مہمان“ ہونے کا اثیش حاصل تھا پوں نازنین بھر پور طریقے سے مصروف ہو گئی۔ ویسے بھی وہ آج کل گھر پر ہی ہوتی تھی۔ باؤس جاب مکمل کر لینے کے بعد اب تک اس نے آگے کے بارے میں کوئی واضح فیصلہ نہیں کیا تھا۔ شاید وہ مانا کی شادی کی تیاریاں دیکھ کے رک گئی ہو۔ جو بھی تھا، اس کی اس فراغت کے حوالے سے میں نے جو خواب دیکھ رکھے تھے وہ ان گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی صرف خواب ہی رہے۔ میرے لیے اس کے پاس وقت ہی نہ بچتا تھا۔ میں صائم بھائی جان کے بچوں اور مینو کی کہنی میں دل بہلانے لگا اور صاحب تو تھا ہی۔

اس دن کیرم کھیلے ہوئے اچانک میری نظر مینو کی کھلائی پگٹی میں چونک اٹھا۔ اس کی سڈول بے تحاشہ سفید رنگ والی کلائی سیاہ کھینچنے والے نازک سے گولڈ برسین۔

میں جگہ گاری تھی۔

”یہ۔۔۔ یہ برسلٹ مینو۔۔۔؟“ میں نے گیم روک کر اس کی کلائی میں جھولتے اس خوبصورت برسلٹ کی جانب اشارہ کیا جو چمکی نظر میں ہی مجھے بہت پسند آیا تھا۔
”اچھا لگ رہا ہے ناں..... پیانے دیا ہے۔“ اس نے کوئین پر نظر جمائے ہوئے کہا۔

”پیانے.....“ نازنین نے میرا اتنی محبت سے دیا ہوا تھکا سے دیتے ہوئے ایک بار بھی یہ نہ سوچا ہوا گاکہ مجھے کیسا لگے گا؟ میرا دل اب گیم میں نہیں لگ رہا تھا۔
”کیا ہوا پائرنٹ؟“ مینو نے میری بدلی بھانپ کے مجھ سے میرے ہی اسٹائل میں سوال کیا۔

”تمہیں میرے کنفلٹس کیسے لگے مینو! میرا مطلب ہے میں تمہارے لیے کنفلٹس لاتے ہوئے یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ دو سال کے عرصے میں تم بڑی بھی ہو سکتی ہو اور وہ بھی اتنی بڑی۔۔۔ میرے ذہن میں تو وہی چھوٹی سی کچھ موٹی سی مینو تھی۔ میں نے کبھی سفٹڈ ٹوائز باربی ڈولڈ اور چاکلیٹس ہی خریدے تھے اور تو تمہارے لیے وہ ڈریس بھی خریدی اور نہ تو اب تمہیں آسکتا ہے نہ کوئی تمہیں پہننے دے گا۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو وہ آپ کے دیے ہوئے کنفلٹس۔ اس لحاظ سے وہ مجھے اتنے عزیز ہیں کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے اور بے فکر رہیں چاکلیٹس میں اب بھی کھاتی ہوں اور ہمیشہ کھاتی رہوں گی۔ سفٹڈ ٹوائز میرے دوست اب بھی ہیں اور ہمیشہ رہیں گے اور اوف..... وہ آپ کا لایا جانٹ سائز چنک میٹھر..... لگتا ہے ان ۱۰ سال میں میری طرح میرا کیونٹی بکلی بھی بڑا ہوا ہے کچھ سے سامنے آ گیا ہے اور وہ

میں تیرا خالی کمرہ ہوں O..... 125

گپو سا ہ..... بٹرکپ اور نوٹی..... سب کے سب بہت جانویں۔“ وہ تیز تیز بولتی ہوئی مجھے یقین دلارہی تھی۔

”مگر وہ ڈریس..... وہ اب تمہارے کس کام کا؟ کیا تم کسی کو گفٹ کر دو گی؟“ یہ نہیں میں کیا جانتا جا رہا تھا۔

”لو..... میں کیوں دوں کسی کو؟ نہیں پہن سکتی تو کیا ہوا ہمیشہ میری وارڈروب میں انکار ہے گا اور مجھے یاد دلاتا رہے گا کہ اسے آپ نے کتنی محبت سے خریدا تھا۔ اب اگر آپ کو سائز کا وہ بیان نہیں رہا تو اس سے تجھے کی قدر تو کم نہیں ہو جاتی اور اتنے پیار سے دیے گئے تجھے کو کسی اور کو دے دینا تجھے کی بھی تو ہن ہے اور اسے دینے والے کی بھی۔ آپ بتائیے کیا میں آپ کے ساتھ ایسا کر سکتی ہوں؟“ وہ بے حد جذباتی ہو کے وہ سب کہہ رہی تھی جو شاید میں جانتا چاہ رہا تھا۔

”تم صرف قد میں ہی بڑی نہیں ہوئیں باتیں بھی بڑی بڑی کرنے لگی ہو اور اچھی اچھی بھی“ میں واقعی اس کی سمجھ داری کا قائل ہو گیا تھا۔ کیا عمر ہوگی اس کی..... چودہ نہیں تو پندرہ برس۔ مگر اپنی عمر کے لحاظ سے وہ اس وقت واقعی بہت میچور خیالات بیان کر رہی تھی اور نازنین جسے میں بہت حساس دل کی مالک سمجھتا تھا اس نے کیا کیا؟ میرے احساسات کی رتی برابر پروانہ کرتے ہوئے اس نے میرا تھکا کسی اور کو دے دیا۔ چاہے وہ اس کی چھوٹی بہن ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے برسلٹ دیتے ہوئے اسے واضح الفاظ میں بتایا تھا۔

”اے شوکیس میں دیکھ کے پہلا خیال جو میرے دل میں آیا تھا وہ یہی تھا نازو..... کہ اسے یہاں نہیں تمہاری کلائی میں ہونا چاہیے۔ میں جانتا ہوں تمہیں چوڑیاں پہننا اچھا نہیں لگتا۔ عید پر بھی تم چند گھنٹوں کے لیے صرف ماما کے اصرار پر

”میری طبیعت ٹھیک نہیں آئی! اور دیے بھی میں وہاں جا کے کیا کروں گی؟“

— १४ —

”وہ کیوں بھئی؟“

آتے ہیں تمہاری فرینڈز کے۔“

چکنی ہو کیونکہ تمہیں ان کی آواز ان کا شور پسند نہیں مگر یہ بریلٹ یہ اتنا ہی خاموش ہے ناز و جنتی کہ تم اور اس خاموشی میں بھی اس کے اندر اتنی ہی شش ہے جتنی تم میں۔ یہ صرف تمہارے لیے بنا ہے۔ اسے ضرور پہنانا نہیں! میں اسے تمہاری کلائی میں دیکھنے کے لیے بے چین ہوں۔“

میری اتنی لمبی بات کے جواب میں اس نے بنا کچھ کہے میرے ہاتھ سے وہ بریلٹ لے لیا تھا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ وہ شاید ابھی اسے پہنے ہی مگر وہ اسے منھی میں دباے دوسری جانب مڑ گئی تھی اور اب میں اسے مینو کے ہاتھ میں دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں مجھ سے ذرا سا بھی لگاؤ ہوتا نا زمین! تب ہی تو میری لائٹ ہوئی کسی چیز سے بھی تم لگاؤ محسوس کرتیں“، مجھ ابھی ایک اور شکایت پیدا ہوئی۔

یہ اس سے اگلی شام کا ذکر ہے کہ میں نے سب بچوں کو سہاوا لے جانے کے لیے جلد از جلد تیار ہونے کا آرڈر دیا۔ میرا خیال تھا کہ نازنین کو بھی یہ کہتے ہوئے ساتھ لے چلوں گا کہ مجھ سے اکیلے اتنے پھوٹے بچوں کو کنٹرول نہیں کیا جائے گا۔ دراصل میں آج اس سے صاف صاف بات کرنا چاہتا تھا۔ میرے دل میں جتنے بھی گلے تھے وہ سب کہنا چاہتا تھا۔ سننا چاہتا تھا کہ میری شکایتوں کا اس کے پاس کیا جواب ہے؟ ہو سکتا ہے کہ وہ حضاتوں سے دل کی بات کھل کے سامنے آئے اور میری شکایتیں بس بے بنیاد ہی ثابت ہوں۔ ان سب کے لیے ضروری تھا کہ ہماری تہائی میں ایک طویل ملاقات ہوتی اور اس کے لیے یہ ایک اچھا موقع تھا لیکن اس نے عین وقت پر جانے سے انکار کر دیا۔ ماما جو ان معاملات میں ذرا فرسودہ خیالات کی مالک تھیں انہوں نے بھی نازنین سے اصرار کیا۔ شاید ان کا خیال ہو کہ نازو ان کی ناپسندیدگی کی وجہ سے جانا نہ چاہ رہی ہو لیکن اس نے ان کے اصرار کو بھی اہمیت نہیں

لاڑکیوں سے فرینڈ شپ ہے۔ لیکن مجھے دوستی کرنا شاید آتا ہی نہیں۔ بچپن سے دل کی باتیں دل میں رکھنے کی عادت ہے حالانکہ بھی کبھی کتنا جی چاہتا ہے کوئی تو ایسا ہو..... کوئی ایک ایسا جس سے دل کی ہر بات کہی جائے سارے سارے دُور سارے دُور سے۔“

”کیا ڈر ہے تمہیں مینو؟“ میں نے رک کے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ تینوں بچے اس وقت ہمارے سامنے لی ٹیپ میں بیٹھے گھوم رہے تھے اور ان کو دیکھ کے مسلسل مسکراتی مینو کے چہرے کے سارے رنگ ایک دم پھیکے سے بڑ گئے تھے۔
”کون سے دُور سے تمہیں سناتے ہیں؟“
”کوئی بھی نہیں..... بس ایسے ہی“ اس نے سر جھٹکا۔

”کیا تم اپنی پیاسے بھی اتنی گلوڑ نہیں کہ ان سے اپنی ہر بات کو سکو؟“ پہلے کی طرح ایک بار پھر میرا دل چاہا کہ ہم دونوں نازنین کی باتیں کریں۔ پتا نہیں کیسا ڈھینٹ اور بے ایمان دل تھا میرا..... سونا نارنگلیوں کے باوجود اسی کی جانب ہنسکتا تھا۔
”نہیں! ان سے تو بالکل بھی نہیں۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ واقعی بہت زیادہ..... اس میں کوئی شک نہیں اور وہ میرا خیال بھی بہت رکھتی ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان میں دوستوں والی کوئی بات نہیں۔ ان کی محبت کا انداز ہی یہی ہے کہ بس زیادہ سے زیادہ خیال رکھ لیا جائے۔ اور وہ مجھ سے اسی انداز کی محبت کرتی ہیں۔ میرے سونے جاگنے کا خیال، میری ڈائنٹ کا خیال، میرے آرام کا خیال، میری تعلیم کا خیال، میری ضرورتوں کا خیال..... اور بس۔“

”کیا میں بھی تمہارا بیٹ فرینڈ نہیں ہوں؟“ مجھے اس چھوٹی سی لڑکی کا چھوٹا سا دکھ بہت برا محسوس ہوا۔ شاید اس لیے کہ میں بھی نازو کی اسی بے اعتنائی کی شکار تھا۔ وہ

دل میں اترنے کے فن سے نا آشنا تھی نہیں جانتی تھی کہ جن سے محبت کی جائے ان کا صرف خیال ہی نہیں رکھتے بلکہ پروا بھی کرتے ہیں۔

”لیکن میں آپ سے بھی اپنے سیکرٹس تو شیئر نہیں کر سکتی۔“ وہ بے چارگی سے بولی تو مجھے اچانک ایک عجیب سا خیال آیا۔ وہ بار بار کن سیکرٹس کا ذکر کر رہی تھی کہیں کوئی لڑکا.....؟ نہیں نہیں..... میں نے اس خیال کو جھٹکا چاہا۔ وہ ابھی چھوٹی ہے بہت چھوٹی۔ میں نے خود کو یقین دلانا چاہا اور اس کی کوشش میں اسے دیکھا تو میرا یقین ڈگمگا سا گیا۔ بلیک جار جٹ کی ہاف سیلوز فنگنگ والی شارٹ شرٹ کے ساتھ اس نے ڈارک گرے ویلٹ کا ٹائٹ ٹراؤزر پہن رکھا تھا جس کے چست پانچوں پر بلیک انمبر اینڈری تھی۔ بلیک اور گرے ڈانس والا شٹون کا لمبا سا دو پٹا ایک جانب شانے پر جھول رہا تھا۔ اس کی بے حد سفید چمکتی ہوئی رنگت سیاہ لباس میں خاصی نمایاں ہو رہی تھی اور گولڈ کی نازک سی چین اس کی کارلر بون کی خوبصورتی کو اجاگر کر رہی تھی۔ اس کی اسکن نو عمری کی شادابی اور جگمگا ہٹ لیے ہوئے تھی۔ بھوری آنکھیں تیز روشنیوں کی زد میں اور بھی کانچ سی لگ رہی تھیں۔ لائنٹ ٹکری لپ اسٹک کے ساتھ ہونٹوں کے اوپر والا سیاہ تھل باریج رہا تھا۔ وہ چھوٹی تو تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ اس کے بارے میں ایسا سوچا نہ جاسکتا..... اور پھر چھوٹی تو میرے لحاظ سے تھی۔ ویسے دیکھا جائے تو وہ ٹین ایج میں داخل ہو چکی تھی۔ اپنے اولیول کے انگیزام دے چکی تھی اور اگلے چند دنوں تک کالج جانے والی تھی۔ وہ اس عمر میں تھی کہ بلاشبہ ایسے خواب دیکھ سکتی تھی، ایسی سوچیں پال سکتی تھی جو کسی بہت گہرے دوست کے علاوہ اور کسی سے شیئر نہ کیے جاسکتے ہوں۔

”تو کیا واقعی کوئی لڑکا.....؟ کوئی محبت و جت کا چکر؟ پل بھر کے لیے میری ساری آزاد خیالی، روشن خیالی کہیں چھپ گئی۔ مجھے یہ سوچ ہی پریشان کر گئی کہ پتا نہیں

وہ لڑکا کون ہوگا؟ کیسا ہوگا؟ مینو سے اس کے تعلقات کس نوعیت کے ہوں گے؟ کیا وہ ملے رہتے ہیں..... اور اگر ہاں تو کیسے..... کہاں؟ مجھے اچانک ہی اس کے ہاتھ میں پکڑے اس بل فون پر بھی اعتراض پیدا ہو گیا۔ ابھی اس کی عمر کیا ہے جو یہ پرسنل نمبر رکھنے لگی ہے؟ دن میں کتنی ہی مرتبہ اسے موبائل کان سے لگائے بات کرتے دیکھتا ہوں اور ہوسکتا ہے وہ لڑکا صاحب ہو ایک ہی گھر میں.....! اپنی اس دنیا نوی سوچ پر مجھے خود حیرت ہوئی اور اس کی اس بات کی وضاحت بھی خود بخود ہو گئی کہ وہ کیوں مجھے اپنا بیسٹ فرینڈ نہیں مان سکتی۔ میں نے ڈائریبل اور نیوٹرل ہوتے ہوئے خود کو سمجھانا چاہا۔

میں تو ساری خرابی ہے، ہم لوگ اپنی نئی نسل کی ہر اس سوچ کو پکھلتا چاہتے ہیں جو اس کی عمر کا تقاضا ہے اور فطرت کے عین مطابق ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم ان کی اننگی تھا میں انہیں بھلے بُرے کی تمیز نہ کھائیں، اوجھنچ بتائیں، ہم ان پر قدغن لگا دیتے ہیں۔ منہ زور جذبات کو راستہ نہ ملے یونہی چور دروازے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر میرا خدشہ درست ہے تب بھی مجھے مینو سے سختی سے کام نہیں لینا چاہیے ورنہ وہ چھپ کے سب کچھ کر لے گی اور خدا نخواستہ کوئی نقصان بھی اٹھا سکتی ہے۔ مجھے ایک دوست ایک ہمدرد بن کے اس کے دل کی بات جاننا ہوگی اور اس کے بعد یہ فیصلہ کرنا ہوتا کہ وہ درست ہے یا غلط؟ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ درست ہے یا غلط۔

”مینو! تم بلا جھجک مجھ سے اپنے دل کی ہر بات کر سکتی ہو۔ یقین کرو میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ تمہارا تو پتا نہیں مگر میں نے تمہیں ہمیشہ اپنا بیسٹ فرینڈ مانا ہے اور ایسا سوچتے ہوئے میں کبھی اپنی اور تمہاری عمر کے فرق کو کچھ میں نہیں لایا اور تم بھی اس فرق کو ذہن سے نکال دو۔ صرف اتنا دھیان میں رکھو کہ یہ شخص جو تمہاری عمر کے

فرق کو کچھ میں نہیں لایا اور تم بھی اس فرق کو ذہن سے نکال دو۔ صرف اتنا دھیان میں رکھو کہ یہ شخص جو تمہارے سامنے کھڑا ہے وہ تمہارا سب سے بڑا خیر خواہ ہے..... اور سب سے اچھا دوست بھی بن سکتا ہے اگر تم اس پر اعتماد کرو تو.....“

”کیا واقعی؟“ اس نے تصدیق طلب انداز میں مجھے دیکھا۔ ”مجھے بھی لگتا ہے کہ گھر میں کسی نہ کسی کو اس بات کا علم اب ہو جانا چاہیے۔“

”ہاں“ اس نے بلا کسی تامل کے اثبات میں جواب دیا اور میں مشکل میں پڑ گیا۔ اب ایک طرح سے میرا امتحان شروع ہونے والا تھا۔ اس سے سوال کرتے ہوئے اندر ہی اندر کہیں میں چاہ رہا تھا کہ وہ میری بات پر کچھ بھنبلا کے کچھ شرما کے کہے گی ”نہیں بھئی“ تو یہ صاعدا بھیا! آپ بھی ناں بس..... ایسی کوئی بات نہیں۔“

لیکن وہ بڑے آرام سے مان گئی تھی کہ اس کی پریشانی کی وجہ ایک لڑکا ہے۔ میں اس سے ایک راز دار دوست بننے کا وعدہ کر بیٹھا تھا لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ کسی بھی وقت میرے ”براڈ مائنڈ“ ہونے کا بھانڈا پھوٹ سکتا ہے۔ ”اپنے گھر کی بچی اپنے ہاتھ میں ہل کے بڑی ہوئی بچی..... اور اس سے اس کے فیئر کے بارے میں سننا بڑا دل گردے کا کام ہے۔ میرا تذبذب شاید میری خاموشی سے ظاہر ہو رہا تھا جس پر اچھ کے کہ وہ پھر بولی۔

”کیا ہوا..... آپ کچھ پوچھیں گے نہیں؟“

”ہاں..... وہ..... کیا کرتا ہے وہ لڑکا؟“ اپنے آپ پر قابو پا کے میں نہ چاہتے

ہوئے بھی پوچھا۔

”تھک کرتا ہے۔“ وہ رو ہانسی ہو گئی۔

کم و بیش اسی پر اہل علم کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ بھی آہستہ آہستہ پاکستان کی اس نئی اور نوجوان نسل کی اس موسٹ پاپولر ایجنسی کی عادی ہو جائے گی۔

”آپ نے اسے دیکھا نہیں ہے ناں..... اس لیے ایسا کہہ رہے ہیں۔ میں سچ کہہ رہی ہوں صاعد بھیا! وہ بالکل کوئی کریملن لگتا ہے۔ میں نے اس کے خط دہیں اس کے سامنے پھاڑ کے پھینک دیے تھے۔ کئی ایک تو پڑھے بغیر..... ورنہ آپ کو دکھاتی اور آپ کو اندازہ ہوتا۔ اس نے مجھے کئی خطرناک دھمکیاں دی ہیں۔ کبھی اغوا کرنے کی، کبھی تیزاب پھینکنے کی، کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ میں نے اس کے پہلے دو تین خط ہی پڑھے تھے پھر خوف زدہ ہو کے پڑھنا چھوڑ دیا۔“

”اچھا.....“ میں اب ذرا سا فکر مند ہوا ”دیکھتے ہیں بھئی اس کو بھی کس کی موت آئی ہے جو ہماری پرنس کو سیزھی نظر سے دیکھ رہا ہے؟“ میں نے ہیردوالے اسٹائل میں بڑھک لگا کر اسے ریٹیکس کرنا چاہا۔

”میرا رزلٹ آنے والا ہے۔ پھر میں کالج میں ایڈمیشن لے لوں گی اور وہی تماشا ایک بار پھر شروع۔ اکثر میں اسے گھر کے باہر کھڑا دیکھتی ہوں۔ کبھی کبھی مارکیٹ میں بھی نظر آتا ہے۔ لگتا ہے یہیں قریب ہی رہتا ہے یا پھر میری وجہ سے یہاں منڈا لاتا رہتا ہے۔ میرے کالج کا پتا لگانا اس کے لیے کون سا مشکل ہوگا۔ اگر یہی سب کچھ رہا تو آئی سویر..... میں گھر سے ٹکنا بند کردوں گی۔ کالج بھی نہیں جاؤں گی،“ اس کی خوف زدہ آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئیں۔ میں نے اس کی مشکل حل کرنے کا وعدہ کر لیا اور اس نے مجھ سے راز داری کی قسم لی۔

”کیا..... کیا کرتا ہے؟“ میں چونکا۔

”تھک کرتا ہے..... اور کیا، یہی تو کہہ رہی ہوں“

”کون ہے وہ؟“ میں نے تفصیل جانتا چاہی۔ اس کی ادھوری باتیں میرے اوپر سے گزر رہی تھیں۔

”لو..... بھلا مجھے کیا پتا۔ پتا ہوتا تو اب تک دماغ نہ ٹھکانے لگا بھیجی ہوتی جناب کے..... پتا نہیں کون لفظگا ہے۔ ناک میں دم کر کے رکھا ہے۔ آج کل تو فری ہوں گھر پہ ہوتی ہوں اس لیے قدرے سکون ہے ورنہ اسکول جاتے ہوئے اس بد تیز نے اس قدر عاجز کر رکھا تھا کہ گھر سے نکلنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میری دین کی لڑکیاں بھی میرا مذاق اڑانے لگی تھیں۔ کبھی فضول کے اشارے کبھی کبھی پھینکنا۔ باقاعدہ آواز لگا کے میرا سیل نمبر مانگا کرتا تھا لوفر..... ارے..... آپ ہنس رہے ہیں۔“

”بات ہی سننے والی ہے۔“ میں اسے اپنے اندازوں کے بارے میں اور ان کے غلط ثابت ہونے کا پتا نہ چاہتا مگر بہی تھی کہ رک نہ رہی تھی۔

”میں جانتی تھی کہ کوئی میری بات پر یقین نہیں کرے گا، نذا سے سیر سیلی لگا۔“

الٹا میری یہ پر اہل علم ہی میں اڑا دی جائے گی لیکن یہ تو میں جانتی ہوں کہ اس لڑکے کی وجہ سے میں کتنی نیس رہتی ہوں۔“

”ہوتا ہے مینو! ایسا ہوتا ہے۔ اب تم بڑی ہوگئی ہو۔ ان چھوٹے موٹے پرائمر کو فیس کرنا بلکہ انہیں ہینڈل کرنا بھی دیکھو ورنہ تمہیں ہراساں دیکھ کے وہ اور بھی دلیر ہوگا۔ ایسے سڑک چھاپ رو میو قدم قدم پر ملیں گے تمہیں۔ ارے کچھ کرتے کرتے نہیں یہ جو ہے..... جسٹ انٹورہم۔“ میرا خیال تھا کہ چونکہ اس کے ساتھ نانا یا یہ واقعہ گزرا ہے اس لیے وہ اسے سیر سیلی لے رہی ہے ورنہ کالج جانے والی ہر بین ایج لڑکی کو

”آپ بیا کو نہیں جانتے۔ وہ ہر بات کا الٹا مطلب لیتی ہیں اور بزدل بھی بہت ہیں۔ پچھلے سات سال سے ان پر ایک ہی خوف طاری ہے اور وہ یہ کہ ہم ”کسی“ کے گھر میں رہتے ہیں اور ہمیں بے حد محتاط زندگی گزارنی چاہیے تاکہ کسی کو ہم پر اعتراض کرنے کا موقع نہ مل سکے۔ انہیں یہ بات بتانا بہت خطرناک ہو گا۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے ان کا ریا ایکشن کیا ہو گا؟“



”یار! آج میری پارٹنر نہیں ہے مزہ نہیں آ رہا۔“ روز رات کو لاؤنج میں ہماری کیرم کی بازی لگا کرتی تھی۔ بچے تو جلدی ہمارا مان کے بارہ بجے تک سونے چلے جاتے البتہ میں اور مینو دیو تک کھلا کرتے۔ لیٹ ٹائٹ کو لڈ ڈرکس کے ساتھ ایک اور دور کچھ نہ کچھ کانے پینے کا چلتا۔ مگر آج وہ نیچے نہ اتری تھی بلکہ میں نے تو اسے ڈرنمیل پر بھی نہیں دیکھا تھا۔ میرے پوچھنے پر تازہ مین نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا اور سنجیدگی سے صرف اتنا کہا۔

”ابھی اسے بھوک نہیں۔“ اس کے بعد میں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ باہر نکل گیا تھا۔ واپس آتے ہی میں نے معمول کے مطابق لاؤنج میں کیرم کی محفل لگانی چاہی۔ صائم بھائی جان کے بڑے بیٹے کو دوبار مینو کو بلانے بھیجا مگر وہ یہی کہتا نیچے اترا کہ ”آبی دروازہ نہیں کھول رہیں۔“ بے دلی سے ایک آدھ گیم کھیل کے میں نے اعلان کر دیا۔

”یار! آج میری پارٹنر نہیں ہے بالکل مزہ نہیں آ رہا۔“

بار ہوا تھا کہ میں نے اس کی اتنی بلند آواز سنی ہو لیکن اس آواز میں..... اس ایک لفظ کی پکار میں صرف یہی ایک بات ایسی نہیں تھی جو غیر معمولی محسوس ہو۔ اس آواز میں ایک تنہیہ تھی، ایک وارننگ، ایک ناگوار سی لکار۔ میں نے اس آواز پر پہلے مینو کو ہڑبواتے پھر شٹلاتے اور پھر گھبراتے دیکھا تھا۔ انہی بدلتے رنگوں کے ساتھ وہ چند سیکنڈ کے اندر اندر وہاں سے غائب تھی اور میں حیران پریشان کھڑا تھا۔ میری عقل آنکھوں دیکھے اس واقعے کی جوتو جیہ پیش کر رہی تھی میرا دل اسے تسلیم کرنے سے انکاری تھا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ بھلا نازنین مینو کو مجھ سے بات کرنے سے کیوں روکے گی؟“ میں نے خود ہی اپنے اس خیال کو چٹک ڈالا لیکن کانوں کی تصدیق کو بھٹلا نہ سکا۔



گیم سینیٹے ہوئے میں نے کہا تھا اور صبح اسے چپ چاپ سا پا کر یہی سمجھا کہ رات اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوگی اسی لیے نہیں آئی۔ لیکن حیرت کی بات تو یہ تھی کہ وہ باقاعدہ مجھ سے کترا رہی تھی۔ مجھے نظر انداز کر رہی تھی اور اگر چاہا کرتے ہوئے اس کی پوری پوری کوشش تھی کہ اس کی یہ حرکت مجھے زیادہ محسوس نہ ہو پھر بھی میں نے اس دانستہ برتی جانے والی بے اعتنائی کو بڑی طرح محسوس کیا۔ کوئی اور ہوتا تو اس طرح کا طرز عمل مجھے ہرگز نہ چونکا تا مگر وہ مینو تھی، وہی مینو جس کے ہر انداز میں میرے لیے والہانہ پن اور گرم جوشی ہوتی تھی۔ مجھے اس کی کترائی سی نظروں میں ایک الجھن بھی صاف نظر آ رہی تھی۔

”بات کیا ہے مینو!“

جس طرح اس نے شام کو لان میں بیڈ منٹن کھیلنے سے منع کیا میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ ”کچھ بھی تو نہیں..... بس دل نہیں چاہ رہا کھیلنے کو۔“ وہ فوراً اُسے پیشتر وہاں سے غائب ہونا چاہتی تھی یہ بات صاف نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس کے مڑنے سے پہلے اس کا بازو پکڑ لیا اور اپنے سامنے کھینچ کر کھڑا کیا۔

”کھیلنے کو جی نہیں کر رہا تو نہ سہی بیٹھو تو کچھ دیر..... اور یہ چہرہ کیوں اتر ا ہوا ہے؟ کہیں وجہ وہی نامعقول لوٹا تو نہیں؟“ اچانک مجھے اس کی واحد پریشانی یاد آئی اور میں جیسے سارا معاملہ بنا پ گیا۔ وہ میرے انداز سے کی تائید یا نفی کرنے کے بجائے چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

”مسئلہ کیا ہے مینو!“ ابھی میں اس کے عجیب و غریب سہے ہوئے گریز کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اندر سے نازنین کی آواز آئی۔

”مینو.....!“ وہ بہت کم اتنی اونچی آواز میں بولا کرتی تھی..... یا شاید ایسا پہلی

”غلط فہمی ہے تمہاری؟ کیا..... کیا نازو نے..... میرا مطلب ہے کیا اس نے خود تم سے یہ بات کہی؟“ اب بھی ایک خوش فہمی سی تھی کہ شاید میری کج روی پر وہ طول ہوئی ہو۔ میری بے اعتنائی کا گھدوہ صائب کے سامنے کر بیٹھی ہو۔ اگر ایسا ہوا ہو تو پھر مجھے اس کی محبت کا ثبوت مل جائے گا۔ اس محبت کا جس کا اقرار وہ کر ہی نہیں پاری۔

”کیا میری آنکھیں نہیں ہیں؟“ وہ الٹا بگڑ گیا۔ ”سب نظر آ رہا ہے مجھے۔ جان بوجھ کے اسے انکور کرتے ہو تم۔“

”میں..... یادہ؟“ میں نے تیز لہجے میں جواب دیا۔ چند لمحے وہ مجھے کریدتی نظروں سے گھورتا رہا۔

”جہاں تک میرا خیال ہے وہ شروع سے ایسی ہی ہے۔ اپنے آپ میں سٹ کے رہنے والی اپنے خول میں بند۔ اس کا بی بیوہ تمہارے ساتھ آج بھی وہی ہے جو چند سال پہلے تھا۔ ہاں بدلے تو تم ہو۔ کہاں تو اس کے گرد منڈلاتے رہتے تھے۔ بہانے بہانے سے اس سے بات کرنے کی کوشش کرتے تھے..... اور تو اور تمہاری نظریں گھر میں ہر وقت ہر جگہ اسے ڈھونڈتی رہتی تھیں اور وہ سامنے ہوتی تو اس پر ہی جی رہتیں اور کہاں اب یہ حال ہے کہ وہ زور دہی ہو تو تم نظریں چرا لیتے ہو کیا ہے یہ سب؟“

”اب مجھے عقل آگئی ہے۔ میں بڑبڑایا۔ اب اسے کیا بتاتا کہ میری انہی دارنگیوں سے تو شاید وہ چٹنی تھی اور اگر میں پروانہ دار اس کے گرد منڈلاتا تھا میری نظریں اس کے چہرے کے طواف میں اور دھڑکنیں اس کے نام کے ورد میں ہمہ وقت مصروف رہتی تھیں تو اس کا فائدہ کیا ہوا؟ کچھ بھی تو نہیں۔ وہ نہ میرے پیار کو سمجھ سکی نہ اس کا ثبوت جواب دے سکی۔ پھر کیا فائدہ ان دو انگلیوں کا؟ اس لیے بڑی مشکل سے

”صاحب! یا تم نازنیں کے ساتھ اچھا نہیں کر رہے۔“ ان میں ٹپکتے ہوئے میں ابھی تک مینو کے عجیب و غریب رویے پر ہی غور کر رہا تھا کہ صائب نے سنجیدگی سے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“ اس نے اور بے بنیاد الزام پر میں تو بھونچکا رہ گیا۔ کیا نازو نے اس سے کوئی شکایت کی ہے؟

”میں دیکھ رہا ہوں جب سے تم آئے ہو مسلسل اسے انکور کر رہے ہو۔ ایک بار بھی میں نے تمہیں اس سے مخاطب ہوتے نہیں دیکھا۔ اس گریز کی وجہ جان سکتا ہوں؟“

مجہ تو تھی..... اور وہ تھی میری ناراضی..... میں روٹھ کے ذرا بے پروا سا بن کے اس پر اپنی خفگی جتنا ناچا پھتا تھا۔ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میری بے پروائی اس پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے؟ لیکن اپنی اس بچکانا ناراضی کا جواز صائب کے سامنے بیان کرنے بجائے میں نے صرف اسے جھٹلایا۔

تو.....

”کیا بکواس کر رہے ہو صاب!“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ اس نے مینو کے ساتھ میرے قلعے کا ذکر کچھ اس انداز میں کیا تھا کہ مجھے بے حد ناگوار سی تکلیف ہوئی۔ میرے چہرے کے زاویے بگڑ چکے تھے۔

”تم جانتے ہو کہ مینو..... وہ تو..... ارے وہ تو میرے لیے..... مارے جھنجھلاہٹ کے میں وضاحت تک بند نہ رہا۔

”تم غلط سمجھ رہے ہو۔“ وہ سنبھلا اور تب اس کے چہرے پر بغالت کے تاثرات دیکھ کے مجھے احساس ہوا کہ بات شاید وہ نہیں سمجھا۔ وہ بھی کہتا کچھ اور چاہتا تھا مگر کہہ گیا کچھ اور..... اور اب اپنی بات کے بھونڈے پن پر خود شرمندہ سا لگ رہا تھا۔

”میرا مطلب وہ نہیں تھا۔ مینو کے بجائے کوئی بھی ہوتا..... میں ہی ہوتا تب بھی نازنین کی فیملگو یہی ہوتیں۔ میں اس حد کی بات نہیں کر رہا جسے رقابت کہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ حسد ہو ہی نہ..... صرف اس بات کی جھنجھلاہٹ ہو کہ تمہاری توجہ اور تمہارا التفات اب اس کے بجائے کسی اور پر ہے۔ تم تو بس نہیں چل سکتا اس کا لیے مینو پر پابندیاں لگا رہی تھی اور یہی بات میرے لیے تشویش کا باعث ہے۔ اگر نازنین جیسی لڑکی جس کے حراج کا نظیر اوڑھو اور تحمل قابل رشک رہا ہے وہ اس طرح اپنی جان سے عزیز لاڈلی چھوٹی بہن سے الگھ سکتی ہے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہاری یہ ڈرامے بازیاں اسے قدر تکلیف دے رہی ہیں۔ میں ہاں تو اسے ڈرامے بازی ہی کہوں گا کیونکہ تم سے بات کر کے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم اس سے اتنے بے نیاز ہو نہیں پھتا کچھ دنوں سے ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔“ اس نے اپنے قیاس کی تصدیق کے

خود پر بند باندھ لیا۔ یہ سوچ کر کہ شاید میرے پیار کو محسوس نہ کرنے والی اس پیار کے ”نہ“ ہونے کو ہی محسوس کر لے۔ کسی توجہ سے ترے ہوئے بچے کی طرح میں اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے الٹی سیدھی حرکتیں کر رہا تھا لیکن یہ راز میں صاب پر تو نہیں کھول سکتا تھا اس لیے فقط اتنا کہا۔

”وہ گزرے کل کی بات تھی۔ تب عمر کا تقاضا اور تھا اب میں میچور ہو گیا ہوں۔“
 ”خاک میچور ہوئے ہو۔ مینو کے ساتھ بڑا بازی چاہتے ہوئے تمہاری میچور بیٹی کہاں جاتی ہے؟ دیکھو صاب! نازنین بہت حساس لڑکی ہے۔ وہ چاہے ظاہر نہ کرے مگر اسے تمہارا رویہ بُری طرح چھ رہا ہے خاص طور پر اس صورت میں کہ تمہاری یہ خود ساختہ تنبیہ جی صرف اس کے سامنے ہی تن کے کھڑی ہوتی ہے۔ سب کے ساتھ تمہارا رویہ ایسا ہوتا تو شاید وہ بھی اسے بدلنے وقت کے ساتھ بدلنے مزاج کا حصہ سمجھتی مگر ایسا نہیں ہے وہ ہرٹ ہوئی ہے۔“

”تمہیں خواب آیا ہے یا الہام ہوا ہے؟“ میں نے اس کے اس دعوے کو ہوا میں اڑا اٹھا چاکر نازد ہرٹ ہوئی ہے۔ ہاں ٹھیک ہے، پتھر نہیں تھی وہ انسان ہے۔ ہرٹ ہو بھی سکتی ہے مگر جہاں تک میں اسے جانتا تھا وہ ان لوگوں میں تھی جو ٹ بھی جائیں تو بکھرتے نہیں اپنے آپ کو سمیٹے رکھتے ہیں۔ وہ بھلا کیسے اپنی تکلیف کا اظہار صاب سے کر سکتی ہے جس سے وہ اتنی بے تکلف بھی نہیں۔

”مجھے اندازہ ہوا ہے اور وہ اس بات سے کہ کل میں نے اسے مینو کو ڈانٹنے سنا ہے۔ وہ اسے صاف صاف منع کر رہی تھی کہ تم سے مناسب فاصلے پر رہا کرے۔ سناتم نے.....؟ اسے اس حد تک ذہنی دھچکا لگا ہے کہ وہ اپنی ہی چھوٹی بہن سے حد محسوس کرنے لگی ہے اور کیوں نہ کرے تم اگر اس کے بجائے مینو کو زیادہ وقت اور توجہ دو گے

لیے میری الجھن بھری آنکھوں میں جھانکا۔ میں مسکرا کے رہ گیا۔ میں نے اپنی ناکامی تسلیم کر لی تھی۔

صاحب تو چلا گیا مگر میرے ذہن کو ایک نئی ڈگر پر لگا گیا۔ اس کی وہ بات جس پر میرا فوری ردِ عمل خاصا شدید تھا اب بار بار دماغ میں گونج رہی تھی۔ وہ کہہ چکا تھا کہ اس کی بات کا وہ مطلب نہیں جو مجھے پہلی بار سمجھ میں آیا تھا لیکن میرا دل تھا کہ اسی ایک مطلب میں انکا ہوا تھا۔

”یہ تو صاحب کا کہنا ہے نا کہ یہ حسد وہ والا حسد نہیں..... نازنین مینو سے رقابت محسوس نہیں کر سکتی مگر محض اس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ ایسا ہو بھی تو سکتا ہے۔ ہاں..... شاید ایسا ہی ہو ورنہ مینو پر مجھ سے ملنے پر پابندی کیوں؟ میرا اس پر توجہ دینا کوئی نئی بات تو نہیں جو آج بطور خاص نازنین کو محسوس ہو۔ میں تو پہلے بھی اس سے زیادہ وقت مینو کے ساتھ ہی گزار رہا تھا۔ ہاں آج اس کے سوچنے کا انداز ضرور بدل سکتا ہے کیونکہ وقت بدل گیا ہے۔ مینو بدل گئی ہے۔ بے شک میرے دل میں اس کے لیے آج بھی وہی جذبہ بات ہیں جو سات اٹھ سال پہلے تھے۔ میرے نزدیک آج بھی وہی دہائی گزرا ہے جسے میں نے بہت پیار سے سنبھالنے کا فریضہ انجام دیا تھا لیکن ہو سکتا ہے نازنین کی نظر میں وہ اب ایک بے ضروری بچی نہ رہی ہو۔ وہ اس کی اور میری بے تکلفی سے خوف زدہ ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے اسے لگا ہو جیسے میں اس کے بجائے مینو سے.....؟“

وہ بات جسے صاحب نے سن کر میں بری طرح بھڑک گیا تھا اور جس نے سچ سچ بہت تکلیف پہنچائی تھی کچھ ہی دیر بعد اب میں اس بات پر سنجیدگی سے غور کر رہا تھا اور میرے دل کو تکلیف ہونے کے بجائے ایک عجیب سی راحت اور آسودگی حاصل ہو

رہی تھی۔ یہ آسودگی اس امکان کی تھی کہ نازنین کے دل میں بھی کہیں نہ کہیں میرے لیے وہی محبت ہے ورنہ وہ خود کو اتنا غیر محفوظ کیوں تصور کرتی۔ یہ محبت ہی تو ہے جو دل میں ہزاروں وجوہ سے جگمگاتی ہے۔ یہ محبت ہی تو ہے جس کے ہر دم چھن جانے کا خوف دل و دماغ پر طاری رہتا ہے اور یہ محبت ہی تو ہے جس کے آگے باقی سارے رشتے، سارے ناتے قیچ نظر آتے ہیں اور یہ محبت..... ہاں، محبت ہی تو ہے جو کالج سے نازک اور شفاف دل میں بھی رقابت کا جذبہ بھر دیتی ہے۔

اس محبت پر ایمان لانا میرے لیے اتنا مشکل نہ تھا جتنا کٹھن یہ تسلیم کرنا تھا کہ وہ واقعی مینو اور میرے تعلق کو کسی اور تناظر میں دیکھنے لگی ہے۔ اس بات کی حقیقت جانچنے کے لیے میں نے مینو سے کچھ اور قریب ہونا چاہا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس نے مینو کو میرے ساتھ زیادہ بے تکلف ہونے سے منع کیا ہے، میں نے خود تکلف کی ہر حد پار کرنے کا ڈراما کرنے کا ارادہ کیا اور یہی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی، ایک شرمناک غلطی۔ جس کا احساس اگرچہ مجھے جلد ہی ہو گیا اور میں نے اس غلط عمل کو دوبارہ دہرانے سے گریز بھی کیا لیکن شاید میں اس ایک غلطی کا ازالہ نہ کر پایا..... اور نہ ہی عمر بھر بھر کپاؤں گا۔

اس رات میں نے اپنے اس وہم کو جانچنے کے لیے جو صاحب نے میرے دل میں پیدا کیا تھا، مینو کو جان بوجھ کے بار بار مخاطب کیا اور وہ بھی ناز و کے سامنے۔ حالانکہ مینو صاف کئی کئی بار ہی تھی اس میں اتنا ہی اسے پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھا رہا تھا۔ ”چپکلی بیٹھی رہو تمہارے بغیر کوئی مزہ ہے یا را“ اسے بازو سے بٹھکے کے میں نے اپنے برابر صوفے پر گرانا چاہا۔ وہ میرے اوپر گرتے گرتے بچی لیکن مجھے اس بات کا کوئی احساس نہ تھا۔ میری ساری توجہ تو ناز و پر تھی جو بظاہر اپنے سامنے سنبڑے میز پر

پھیلائے ہوئے تھی مگر جس کی آنکھیں سرسری سے انداز میں میری اس حرکت پر اٹھیں اور پھر اس کی پیشانی لا تعداد ناگوار شکائوں سے بھر گئی تھی۔ میں نے مینوکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے دبائے رکھا اور خود کوئی دی میں گن ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ مینوکا ہاتھ پکڑنا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی اور اب بھی اس کا نرم گداز مکھن سا ہاتھ میری گرفت میں دبا میرے اندر کوئی بھی احساس جگائے میں سراسر ناکام تھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ میں کبھی بھی اپنے اندر اس کے لیے ایسے جذبات نہیں پیدا کر سکتا جن کا خدا شہناز کا تھا۔ جتنی دیر تک اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دبا رہا مجھے اس کی بے چینی اور اضطراب صاف نظر آتا رہا۔ بالآخر جب اس کی برداشت کی حد ختم ہو گئی تو وہ اٹھی اور میرے نزدیک سے گزرتے ہوئے اس نے منگ لہجے میں مینوکا کہا۔

”ٹھو مینو! ڈانٹنگ ٹیمبل لگاؤ۔ ہر وقت بیٹھی ہی رہتی ہو۔ ایک بار کی کہی بات تمہیں یاد نہیں رہتی کیا؟“

آخری فقرے میں کیا تسخیر تھی وہ میں بھانپ گیا۔ میرے ہونٹوں پر دہلی دہلی سی مسکراہٹ در آئی۔ مینوکا ہاتھ اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہیں مجھے اس کی ہلکی سی کپکپاہٹ سے احساس ہوا کہ اپنی اس حرکت کے بارے میں میں نے یہ تو سوچا ہی نہیں کہ اس کے نتیجے میں بے چاری مینوکا اپنی پیاسے کتنی ڈانٹ پڑنے والی ہے۔ شاید اسی لیے اس کا رنگ فاق ہو چکا ہے۔ اسے مرے قدموں سے نازو کے پیچھے جاتا دیکھ کے مجھے افسوس سا ہوا۔

کھانے کے دوران میں نے چند اور حرکتیں کیں۔ میں مینو کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ یہ بھی خاص نئی بات نہ تھی۔ ایسا اکثر ہوتا تھا لیکن آج میں یہ ظاہر کر رہا تھا جیسے مینو کے سوا اور کوئی میرے ساتھ بیٹھا ہی نہ ہو۔ خصوصاً نازو سے تو میں یوں لا تعلقی برت رہا

تھا کہ وہ یقیناً اندر ہی اندر جل بھن رہی ہوگی۔ چور نظروں سے میں نے دیکھا وہ پلیٹ میں کتنی کے چند چاول کے دانے ڈالے، چمچ سے انہیں بکھیر رہی تھی۔ اس کی بے دلی دیکھ کر سالوں سے ناقدری کا شکار میرا دل تسکین پانے لگا۔ پرانہیں کیوں تب میں ایسا اذیت پسند بن رہا تھا۔ اس کی محبت مجھے اس طرح توڑ ملی تھی جیسی لٹی چائے تھی۔ اس لیے محبت پانے کا دوسرا طریقہ اختیار کر بیٹھا جو سراسر بھونڈا تھا۔ پھر میں نے مینو کے پیالے میں سے اسی کے چمچے سے کھیر کھانی شروع کر دی۔ ایسا کرتے ہوئے میں نازو کے چہرے پر نظر ڈالنا نہیں بھولا تھا اس کی رنگت پھلکی پر پھلکی تھی۔



”تمہاری شادی کی تاریخ رکھ دی ہے ہم نے۔“ ماما نے خوشی سے چور لہجے کے ساتھ اطلاع دی۔ میرا دل عجیب جذبات میں گھر گیا۔
مجھے خوش ہونا چاہیے تھی۔ میں خوش ہوا لیکن یہ خوشی کسی انجانے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔

”مبارک ہو!“ اس وقت سے سب کی مبارک بادیں ہی وصول کر رہا تھا لیکن مینو کی آواز بڑی بھیجھی سی لگی۔

”اب تمہیں کیا ہوا؟ کیا پھر ڈانٹ پڑی ہے اپنی پیاء؟“
”وہ تو کل سے مجھ سے بات ہی نہیں کر رہی ہیں۔“ وہ روہائی ہو رہی تھی۔
”اس لیے منہ لڑکا ہوا ہے۔ خیر کمر نہ کرو تمہاری پیاء میری نگرانی میں آنے والی ہے۔ خوب کس کے رکھوں گا۔ مجال ہے اس کی جو میری میسٹ فرینڈ کو میز می نظروں سے دیکھ بھی سکے۔ میری پہلی وارنٹک ہی اسے یہ ہوگی کہ نیگم مجھے خوش رکھنا ہے تو پہلے میری مینو سے بنا کے رکھو۔“

”یہ بات نہیں ہے۔ میں..... میں تو کسی اور وجہ سے پریشان ہوں“ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں یہ اب مجھے غور کرنے پر نظر آیا۔

”اسی لڑکے کی وجہ سے؟“ پہلی بار مجھے یہ معاملہ نوعیت کا لگا۔ اس دن تو بات ہنسی میں لڑگئی تھی لیکن اب واقعی اس ان دیکھنے انجانے لڑکے پر مجھے سخت تاؤ آ رہا تھا۔ میرا بس نہ چل رہا تھا ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں مجھے اس کا پتا چل جائے۔ بھلا اس کی ہمت کیسے ہوئی اتنی معصوم لڑکی پر بڑی نظر ڈالنے کی۔ میں اندر ہی اندر طیش اور غیرت سے ابل رہا تھا کہ کسی احساس نے میرا یہ اہال ایکدم جھاگ کی طرح بٹھا دیا۔

”جب سے آئے ہو گھڑی بھر سکون سے میرے پاس نہیں بیٹھے۔ گھر میں کلو تو ماں نظر بھی آئے“ ماما کے پیار بھرے شکوے پر میرے باہر نکلتے قدم ختم گئے۔ میں پانا اور ان کے شانے پر اپنا بازو پھیلا کے بیٹھ گیا۔ اچھی خاصی محفل جی تھی۔ سبھی تھے سوائے اس کے..... اور تقریباً سبھی کے تاثرات خاصے معنی خیز تھے۔

پاپا تھے جو مونے عدسوں کے چشمے کی اوٹ سے مسکراتی نظریں مجھ پر جمائے ہوئے تھے۔

ماما تھیں تو وہ بھی میرے بالوں میں پیار سے ہاتھ بھرتی ایک تمہید باندھنے والی مسکراہٹ چہرے پر جمائے ہوئے تھیں۔ ردابہ بھائی بھی اپنی ننھی بیٹی کو گود میں تھکتے ہوئے بڑے پراسرار طریقے سے مسکرا رہی تھیں۔ صائم بھائی مجھے دیکھتے ہی آنسوؤں سے سر ہلانے لگے تھے۔ یہ الگ بات کہ ان کا انداز سر ہلانے کا تھا۔

”یہ کیا کانفرنس چل رہی ہے بھی؟“ میں سنبھل کے بیٹھا۔

”تم خود کیا کر رہے ہو صاعد منظور..... اتنی معصوم لڑکی کے ساتھ؟ وہ لڑکی جو تمہارے ہاتھوں میں پل کے بڑی ہوئی تمہاری گود میں سیر کرتی رہی..... آج تم اسے استعمال کر کے ناز کو پانا چاہتے ہو۔ اسے میزگی بنا کے اس کے دل میں اتارنا چاہتے ہو۔“

پتا نہیں کیسے میں اس آئینے کے زبرد آ گیا تھا۔ اچانک بالکل اچانک۔ اس لیے سچائی سامنے آتے ہی ہڑبڑا کے رہ گیا۔ سنبھل کے میں خود کو وضاحت دیتا ہی چاہتا تھا کہ وہ پھر کبہر گئی۔

”پلیز! کچھ کیجئے صاعد بھیا! کچھ روز تک میرا کالج اسٹارٹ ہو جائے گا۔ یہ بدتمیز انسان تو میرا بیٹا حرام کر دے گا۔ ابھی میں رودابہ جالی کے ساتھ نزدیک والی مارکیٹ تک گئی تھی وہ نہ جانے کہاں سے نکل کے سامنے آ گیا۔ راستے بھر اس نے ہر وہ حرکت کی جس سے میں پریشان ہو سکتی تھی، گھر تک چھوڑ کے گیا ہے۔ پتا نہیں رودابہ جالی کیا سوچتی ہوں گی ویسے انہوں نے ظاہر تو نہیں کیا مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ انہیں احساس نہ ہوا ہو۔ اگر انہوں نے کوئی غلط مطلب نکال لیا تو.....“ وہ رو پڑی۔

”اس طرح رونے سے کچھ نہیں ہوگا مینو! تم بس ایک کام کرو میرے ساتھ مارکیٹ تک چلو۔ اگر وہ تاک لگا کے بیٹھا ہوگا تو ضرور سامنے آئے گا۔ بس ایک بار نظر آ جائے..... میں اس کا وہ حال کروں گا کہ تمہارا پیچھا کرنا تو ایک طرف، وہ اپنے بیروں پر چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے گا۔“

”میں ایک مووی ریٹ پر لائی ہوں کل واہس کرتی ہے۔ آپ کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی۔“ اسے حاضی تسلیم ہوئی تھی۔ کم از کم چہرے کی رنگت تو بحال ہوئی گئی تھی

مگر میرا دل سنبھل نہیں رہا تھا۔ کسی طرح اس کے سامنے میں نے خود کو کمپوز کیے رکھا لیکن اکیلے میں یہ تلخ حقیقت اور بھی بڑی طرح کھلنے لگی۔

”میری نیت تو پاک ہے نا..... میرے دل میں آج بھی مینو کے لیے کوئی غلط خیال نہیں نہ ہی کبھی آ سکتا ہے۔“ میں نے صفائی پیش کرنا چاہی۔

”مگر یہ غلط خیال میں نازمین کے دل میں ڈالنے کی کوشش کیوں کر رہا ہوں اور وہ بھی مینو کے حوالے سے؟ کیا میں نہیں جانتا کہ نازو سے ایک نئے رشتے میں بندھ جانے کے بعد میرے اور مینو کے تعلق کی نوعیت بھی بدلے والی ہے اور ہمارا رشتہ ایسے شرمناک و سوسا کا قہقہہ نہیں ہو سکتا۔ پھر کیوں بغیر سوچے کچھ میں نے یہ بے حکمی حرکت کرنا چاہی۔ اگر خدا خواست نازو نے میری اس بچکانہ اور احمقانہ حرکت کو سنجیدگی سے لے لیا تو یہ ہمیشہ کے لیے اس کے دل میں بیٹھ سکتا ہے اور ہم بیٹیوں کی آئندہ زندگی میں زہر گھول سکتا ہے اور اگر کبھی اس نے اپنے اس وہم کو زبان دے دی تو کیا میں مینو کو بھی اپنی شکل دکھا سکوں گا؟ میرے دل نے اس ساری صورت حال کا ایسا نقشہ کھینچ کر میرے سامنے رکھا کہ میں لرز اٹھا۔

”یہ میں کیا کرنے جا رہا تھا؟ شکر ہے وقت پر عقل آ گئی۔ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا کسی نے اس بات کو محسوس نہیں کیا ہوگا، حتیٰ کہ مینو نے بھی نہیں۔ مجھے اب دوبارہ ایسا خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہیے اور نہ ہی نازو کے دل میں پیدا ہونے کی نوبت آنے دینا چاہیے۔ یہ میں اس کے دل میں چھپی محبت بھاٹنے چلا تھا یا اس کے دل کو دوسوسا اور شک سے آلودہ کرنے؟ لعنت ہے میری سوچ پر۔ جی بھر کے میں نے اپنی گزشتہ دو دن کی حرکتوں پر لعنت ملامت کی۔ وہ حرکتیں جو اور کسی کی نظر میں خلاف معمول اس لیے نہ ٹھہرائی جا سکیں کہ مینو سے میں ہمیشہ سے قریب تھا لیکن یہ میرے

دل کا چور تھا جو مجھے شرمندہ کرتے تھک نہ رہا تھا۔ اپنے آپ کو پھینکارنے کے بعد مجھے ناز میں یہ غصہ آنے لگا۔

”یہ وہی ہے جس کی وجہ سے میں یہ صافقت کرنے پر مجبور ہوا۔ نہ وہ مجھے کسائی، نہ میرے دل میں الے سیدھے خیالات آتے۔ کیا ہے جو وہ سیدھے طرے لیتے ہے مان جانے، تسلیم کر لے کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ کیوں ترسانی ہے مجھے؟ دو لفظ اقرار کے نہ سہی ایک نظر اعتماد کی ہی سہی۔ مگر یہاں تو یہ بھی میرے نصیب میں نہیں۔ لگتا ہے اس کے پاس دل ہی نہیں اور اگر ہے۔ تو اس دل میں میرا گز نہیں۔ میری خیالت نے کچھ کھلیا ہٹ کا روپ دھار لیا میں ایک بار پھر دل ہی دل میں اس سے ناراض ہو گیا۔ اتنا ناراض جتنا پاکستان کوٹھے ہوئے تھا۔ ہماری شادی کی تاریخ مقرر ہونے کی خبر بھی اس ناراضی کو کم نہ کر سکی۔ اور اس بار یہ غصہ اس پر بتانے کا موقع بھی مجھے مل گیا۔

اگلی شام کو حیرت انگیز طور پر وہ میرے سامنے تھی، میرے ہی کمرے میں۔ میں جتنا حیران ہونا کم تھا مگر میں نے اپنی حیرت کو چھپانے کی حتی الامکان سعی کی۔

”جیسے تم سے بہت ضروری بات کرنا ہے۔“

اس کے لہجے کی خوفناک سنجیدگی نے مجھے ڈرا دیا۔ مجھے حشر ہوا کہ وہ مجھ سے جواب طلبی کرنے آئی ہے۔ کہیں وہ مینو اور میرے معاملے کو نہ چھیندے۔ دل کے اس چور نے مجھے اس کا وہ بیان دوسری جانب لگانے پر مجبور کر دیا۔

”میں جانتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے کون سی ضروری بات کرنا ہے۔ تم یہی کہنے آئی ہو ناں کہ تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں؟“ میری بات پر وہ کھنگالی، میرے ہونے لگی اور یہی میں چاہتا تھا کہ وہ قہر سے بھول ہی جائے کہ وہ مجھ سے اصل میں کیا

بات کرنے آئی ہے۔ اپنی جھوٹی ڈرامے بازی کا میرے پاس کوئی معقول جواز نہیں تھا۔ وہ میں اس کے سامنے پیش کرتا۔ بس یہی ایک راستہ تھا کہ بات پلٹ دی جائے۔

”اور تم مجھ سے یہ چاہتی ہو کہ کوئی بہانہ بنا کے یہ شادی رکوا دوں۔ تمہاری خواہش پوری کرنے کے لیے سارا الزام اپنے سر لے لوں مگر سوری! سوری ناز میں تمہارا میں ایسا نہیں کر سکتا۔“

”صاعدا اتم..... تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟“ حیرت کی شدت سے اس کی آواز پھٹی پٹی سی تھی۔

”معذرت کر رہا ہوں کہ تمہارا یہ کام کم از کم میں تو نہیں سکتا۔ ہاں تم پابند نہیں ہوں نہیں کرنا مجھ سے شادی تو ٹھیک ہے، جب تک مت کر دو لیکن میرے کاغذ پر ہندو کی رکھ کے چلانے کے بجائے تم خود کیوں نہیں بہت کرتیں۔ کیا اس لیے کہ تمہارا نیک پروین والا منج سب کی نظروں میں بن رہے اور ماما پاپا کے نزدیک میں بُرا بن جاؤں نہیں ناز میں!..... یہ کام تو تمہیں خود ہی کرنا پڑے گا۔“

اس کے چہرے کے بدلتے رنگ مجھے اتنا لطف دے رہے تھے کہ میں بولتا ہی چلا گیا۔ چنانچہ میری محبت اتنی اذیت پسند کیوں ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جو مجھے جان سے عزیز تھی اب اس کی جان نکالنے کے درپے تھا میں۔ اس کی حالت یوں تھی گویا کوئی ہلی جاتا تھا کہ وہ گزرتی۔

”میں..... میں..... میں نے ایسا تو نہیں کہا صاعدا!“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس سے پہلے کہ وہ روئی ہوئی کمرے سے نکل جاتی میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے روکا اور اپنے سامنے جیڑ پر بٹھالیا۔ ”میں نے ایسا تو نہیں کہا صاعدا نہ ہی میں یہ چاہتی ہوں“ آنسو بھری آنکھیں اٹھا کے اس نے مجھے دیکھا اور میرا دل جو کتنے دنوں

سے اس کے لیے وحشی سا ہوا ہاتھا موم ہو گیا۔ ان نظروں میں وہ سب تھا جس کی پیاس مجھے گزشتہ کئی سال سے تھی۔ ان نظروں میں مجھے کھونے کا خوف بھی تھا اور میری بدگمانی کا ڈر بھی..... جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے اتنی ہی محبت کرتی ہے جتنی میں اس سے۔ بس اسے اس محبت کو برتنے کا یلقتا نہ تھے نہ جتانے کا قرینہ۔

”جاننا ہوں میں.....“ میں نے اس کے مسلسل بہتے آنسو اپنی انگلی کی پور پر پٹنے۔ ”پھر کیوں کرتی ہو تم ایسا؟“

”میں نے کیا کیا ہے؟“ آنسوؤں کی اوٹ سے بے پناہ حیرت ان آنکھوں میں سے جھانک رہی تھی۔ میں ایک گہری سانس بھر کے رہ گیا۔

”یہی تو سارا رونا ہے..... تم کچھ کرتی تو نہیں ہو۔ نہ کرتی ہو نہ کہتی ہو اور تمہارے اس کچھ نہ کرنے اور کچھ بھی نہ کہنے نے مجھے کتنی بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے جانتی ہو تم؟“

”کیا کرتا چاہیے مجھے..... اور کیا کہنا چاہیے؟“ وہ حیا سے چور لہجے میں ہنسی پلکیں جھکائے مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ اس کے رخساروں پر ابھی آنسوؤں کے نشان باقی تھے اور لبوں پر ایک شگلیں مکان کا راج تھا۔ آنسوؤں اور مسکراہٹ کا یہ سنگم کتنا دل نشیں تھا اور اس کا وہ سوال وہ تو مجھے ہواؤں میں ہی اڑانے لگا۔

”اچھا! اب یہ بھی میں بتاؤں؟ چلو..... سکھا دیتے ہیں نین بھی۔ آخر تو میرے ہی کام آئے گا اب دن ہی کتنے رہ.....“

”صاعد بھیا.....! یہ مودی.....“ اچانک دروازہ کھلا اور مینو حجب عادت زور زور سے ہلکتی اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں وہ سی ڈی تھی جو شاید وہ واپس کرنے کے لیے میرے ساتھ مارکیٹ جانا چاہتی تھی۔ ہم دونوں کو اتنے قریب دیکھ کے وہ شہنشاہی

گئی اور اس کی بات اس کے منہ میں رہ گئی۔ میری حالت بھی کچھ مختلف نہ تھی۔ وہ پل جس کا مجھے سالوں سے انتظار تھا بس ایک ہاتھ کی دوری پر تھا پھر اقرار کے یہ ریشمی لمبے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری یادوں کا سنہری عنوان بن جاتے..... کہ وہ چلی آئی۔ میں تو بد مزہ ہوا لیکن ناز کے تاثرات ہم دونوں سے مختلف نہ تھے۔ وہ کڑی نظروں سے میو کو گھور رہی تھی۔

”ہاں یو لمیو؟“ ذرا سنبھل کے میں نے پوچھا مگر اس کی گھبراہٹ ناز کے تیور دیکھ کے سوا ہوجی تھی۔

”نہیں! کچھ نہیں..... وہ..... میں سمجھی آپ اکیلے ہیں۔“ یہ کہہ کے وہ پلٹنے لگی کہ ناز کی خشک آواز نے ماحول میں مزید ہر گھولا۔

”ایسی کون سی بات ہے جو اکیلے ہی ہو سکتی ہے۔“ اس کے اس فقرے میں کتنا تکلیف دہ تاثر تھا اسے شاید مینو نے اس طرح محسوس نہ کیا جتنا کہ میں نے۔ یہ بات کرنے کے بعد وہ بھی کمرے میں نہر کی اور میں

دیر تک خود کو ستارہا۔

”تیرا ہر اسی کیا دھرا ہے اب بھگتو۔“



لیکن وہ ضروری بات بھی کون سی ہو سکتی ہے جو اتنی رات کو یاد آئی ہے؟ میں سوچنے لگا۔
نازنین کی وجہ سے موڈ خراب ہونے کے باوجود میں مینو کے ساتھ پیدل
مارکیٹ گیا تھا کیونکہ بہر حال اس کا مسئلہ بھی اہم تھا۔ میں اس لوفلز کے کی طبیعت
اچھی طرح صاف کرنا چاہتا تھا اور اس وقت میرے اندر جو غصہ بھرا پڑا تھا وہ سارے کا
سارا اس پر نکل سکتا تھا اگر وہ مجھے نظر آ جاتا تو..... لیکن افسوس میری بھڑا دل میں ہی
رہ گئی۔ میں مسلسل دائیں بائیں نظریں گھما کے جائزہ لے رہا تھا۔ مینو بھی مایوس نظر آ
رہی تھی۔

”لگتا ہے آج یا تو وہ آیا نہیں یا پھر آپ کو دیکھ کے دور سے ہی کھسک گیا۔“
واپسی پر اس لڑکے کے انتظار میں میں مینو کو لے کر آئس کریم پارلر بھی چلا گیا کہ
شاید اس دوران میں وہ کہیں نہ کہیں سے نکل آئے حالانکہ مینو جانا نہیں چاہ رہی تھی۔
”کیوں بھئی آئس کریم سے تو تمہارا ازلی بیر ہے۔ تمہارا ہی قول ہے کہ جہاں
دیکھو اسے ختم کر ڈالو منہ ڈالو اس کا نام و نشان۔“

”بس..... ویسے ہی..... دل نہیں چاہ رہا“ پھرے کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بھی
بجھا بجھا سا تھا۔ مجھے اس کی جو صرف کچھ دیر قبل ہونے والی تخی ہی لگ رہی تھی لیکن اس
بار مجھے خود پر غصہ نہیں آیا۔ مجھے اس سارے قصے میں ناز و زیادہ قصور وار لگ رہی تھی۔
ٹھیک ہے میرا دل بے ایمانی کا مرتکب ضرور ہوا تھا۔ میں نے یہ گھٹیا طریقہ
اختیار کرنا بھی چاہا تھا لیکن دیکھا جائے تو عملی طور پر میں نے ایسا خاص کچھ کیا تو نہیں
تھا۔ بات بڑھنے سے پہلے ہی میں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ سارا قصور نازنین کے
شک نے پھیلایا تھا بلکہ میرے دل میں یہ نامعقول خیال آیا بھی اسی کی وجہ سے تھا اور
اب جب میں تو بہت تک کر چکا تھا پھر بھی اس کا ہم دونوں کو یوں خصوصاً مجھے..... شک کی

رات کو میں ابھی سونے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ میرے سیل پر وقفہ وقفہ
سے ادھوری نیل بجنے لگی۔ ابھی میں ہاتھ آگے بڑھانے ہی لگتا کہ نیل خاموش ہو
جاتی۔ سستی اور دماغی بو جھلپن کی وجہ سے میں نے یہ تک دیکھنے کی زحمت نہ کی کہ یہ
حرکت کرنے والا کون ہے؟ نیند زیادہ ہی غالب آنے لگی تو میں نے ناچار اٹھنا گوارا
کر ہی لیا تاکہ سیل فون آف کر دوں اور یونچی آف کرتے کرتے میں نے بالا ارادہ ہی
ایک نمبر پیش کر کے دیکھ لیا کہ مجھے یہ کس کا لڑکس کے نمبر سے آ رہی ہیں اور نمبر دیکھتے
ہی میں الجھن میں گرفتار ہو گیا۔

وہ نمبر مینو کا تھا۔ میں نے ایک نظر وال کلاک پر ڈالی اور پھر دوبارہ اسکرین پر
روشن نام کو دیکھا۔

یہ مینورات کے اس وقت مجھے سیل کیوں دے رہی ہے جبکہ وہ اسی گھر کے ایک
کمرے میں مینو..... لکٹی ضروری بات کرتی ہے تو خود آ کے کیوں نہیں کر لیتی۔

157.....O.....میں تیرا خالی کمرہ ہوں

”وہ آیا تھا..... وہی.....؟“ اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے بتایا۔ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میں بے یقینی سے کبھی اُے، کبھی اس کمرے کے دروازہ کو دیکھنے لگا۔ مجھے شک ہوا کہ اس لڑکے کا فوٹو مینو کے دل و دماغ پر اس بُری طرح حاوی ہو چکا ہے کہ اب اسے گھر کی محفوظ چار دیواری کے اندر اپنے کمرے میں بیٹھ کے بھی اسی کا خوف ستا رہا ہے۔

”وہاں..... وہاں دیکھا تھا میں نے اے“ اس نے باہر کی جانب کھلنے والی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے پردے ہٹا کے دیکھا۔ یہ کمرہ پورٹیکو کے اوپر بنا تھا اور اس کھڑکی سے مین گیٹ اور اس کے پار اسٹریٹ کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ مین گیٹ کے اوپر گنگے دونوں بلب اور کچھ فاصلے پر لگی اسٹریٹ لائٹ روشنی تھی مگر سب کچھ دیران بڑا تھا۔ کوئی کئی فی روح تھا نہ کسی آواز کا شائبہ.....!

”اسی وقت میں نے آپ کو تیل دی تھی تاکہ میں آپ کو دکھا سکوں۔ کافی ریت تک وہ گیت پڑھ رہا۔“

”تجہیں کیسے پتا چلا؟ کس نے کہا تھا آدھی رات کو کھڑکی سے جھانکنے کو؟“ میں اسے ڈانٹنے لگا۔

”میں نے کھڑکی نہیں کھولی“ وہ پھر سے رونے لگی۔ ”میں تو سو رہی تھی اچانک کھڑکی پر کچھ آ کے لگا تھا۔ ایک بانئیں دو تین بار ایسا ہوا جیسے کوئی ننگر مار رہا ہو کھڑکی کے شیشے پر۔ میں نے ذرا سا پردہ ہٹا کے دیکھا تو وہی تھا۔ گیٹ کے بالکل پاس۔ اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسی وقت آپ کو بلانا چاہا لیکن آپ نے اتنی دیر کر دی۔“

”ممنون بھی تو کر سکتی تھیں؟“

”میں نے سوچا‘فون پر باتیں کریں گے تو صاحب سن لے گا۔ پھر اسے بھی پتا

156.....O.....میں تیرا خالی کمرہ ہوں

نظر سے دیکھنا مجھے ہنسنے نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اس سے صاف صاف بات کروں گا۔ بے چاری مینو کا تو اس سارے قصے میں کوئی کردار ہی نہیں تھا۔ وہ تو اپنے ہی مسئلے میں الجھی ہوئی تھی، اس کی عمر کے لحاظ سے فی الحال یہی مسئلہ اس کے لیے بہم بھی تھا اور عقین بھی۔ میں نے ادھر ادھر کی ہلکی پھلکی باتیں کر کے اس کا دھیان بنانے کی کوشش کی اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سب جھنائے ہنسی مسکراتی میرے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ اور اب..... رات کے وقت یہ مسلسل جیتی بیل.....!

کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے نمبر ملایا۔ اب اس کا موبائل آف تھا۔ میں جھنجھلا اٹھا۔ بلاخر میں نے اپنی ٹریٹ کے ٹیمن بند کیے۔ سلیپر اپنے درمیتو کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ میں صاب کرجگا کے اسے بتانا چاہتا تھا مگر پھر اس کی گہری سون سکون نیند دکھ کے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

”میں ہوں..... صاعد!“ اپنی دستک کے جواب میں اس کی بے حد سہمی ہوئی آواز بر میں نے کہا۔ اگلے ہی لمحہ وہ دروازہ کھول کے سامنے آ گئی۔

”صا..... صاعد بھیا! آپ..... آپ اب آئے ہیں..... میں کب سے آپ کو.....“ وہ روتی جارہی تھی اور کہتی جارہی تھی۔

”ہوا کیا ہے منو.....! کیوں رو رہی ہو؟“ میں واقعی گھبرا گیا۔ اس کی حالت سے لگ رہا تھا وہ مجھے دکھ کے اپنے آنسوؤں پر سے اختیار نہیں کھو بیٹھی بلکہ کافی دیر سے رو رہی ہے۔ مجھے اب احساس ہوا کہ اپنی سستی کے ہاتھوں کافی دیر تک اس تیل پر توجہ نہ دے کر میں نے اچھا نہیں کیا۔ کوئی بہت بڑی بات ہوئی ہوگی جو وہ اتنی رات گئے مجھے بتا رہی تھی۔

چل جائے گا۔“

”تو چل جاتا..... بلکہ ہم دونوں مل کے ٹھکانی کرتے اس کی۔ اتنی ہمت بڑھ گئی اس بد بخت کی کہ اب ہمارے گھر تک آنا پہنچا۔ اب تو مجھے کل سے چوبیس گھنٹے بھی پہرا دینا پڑا گھر کا تو میں دوں گا۔ اس کچھوڑوں گانہیں“ مجھے اس سڑک چھاپ کی دیدہ دلیری پر تاؤ آ رہا تھا اور وہ تھی کہ مسلسل روئے جاری تھی۔

”اب کیا ہوگا صاعد بھیا! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ پتا نہیں وہ کیا کرے..... اور سب کیا سمجھیں۔ کہیں یہ تو نہیں سمجھیں گے کہ میں بھی..... اور مجھے تو لگ رہا ہے آپ کو بتا کہ بھی میں نے غلطی کی ہے۔ اب آپ اس سے چھڑکیں گے مار پیٹ کریں گے۔ اگر معاملہ زیادہ خراب ہو گیا تو کتنی بُری بات ہوگی۔ سب میری وجہ سے ہوگا۔“

”کچھ نہیں ہوگا۔ اس کی ہمت بھی اس لیے بڑھی ہوگی کہ تم نے نہ تو کسی کو بتایا نہ کسی نے اس سے باز پرس کی۔ ایک بار ہاتھ آ جائے تو..... اب خدا کا واسطہ ہے تم تو پُپ کر جاؤ۔“ اس کے لگا تا رہتے آسو مجھے پریشان کر رہے تھے۔ اتنے میں دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھلا اور اگلے ہی پل نا زمین ہمارے سامنے تھی۔ اپنی بے پناہ حیران آنکھوں کے ساتھ۔

اس کی آنکھوں میں نہ جانے ایسا کیا تھا کہ مینو کے آسو صاف کرنے میں مصروف میں بُری طرح گھبرا گیا۔ حالانکہ آج ہی میں نے یہ مصمرا وہ کیا تھا کہ پیار سے یاختی سے، کسی بھی طرح ناز کے دل سے یہ انخو خال نکال کے رہوں گا۔ جس کی وجہ سے میں روز بروز خود اپنی نظروں میں بے وقعت ہوتا جا رہا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ میری گھبراہٹ میری پوزیشن اور آکورد کر دے گی اس کے باوجود میں اس پر قابو پانے میں خاص کامیاب نہ ہو سکا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ سپاٹ لہجے میں اس نے پوچھا تھا۔

”یار.....! اتنی سمجھاؤ ناں اسے..... خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہے۔ پاگل ہو گئی ہے بالکل“ میں نے سوچ لیا بے شک مینو ناراض ہو جائے میں ناز و کوساری بات الف سے بے تک مدد دیتا ہوں۔ ظاہر ہے رات کے اس وقت اس کمرے میں اپنی موجودگی کا میں کیا جواز پیش کر سکتا تھا۔ جھوٹ بولنے سے مزید مشکلات پیدا ہونے کا خدشہ تھا اور پھر میں جھوٹ بولتا تو آخر کس لیے؟ جھوٹ کسی چیز پر پردہ ڈالنے کے لیے بولا جاتا ہے اور میرے دل میں ایسا کچھ نہ تھا جس کی پردہ پوشی کی ضرورت ہوتی۔

”وہ تو نظر آ رہا ہے۔“

”میں اس سے یہی بات کر رہا تھا کہ ایسی گھبرانے یا دل برداشتہ ہونے والی کون سی بات ہے۔ تم نا زمین سے بھی کہہ سکتی ہو وہ تمہیں.....“

”وہ مجھ سے کیا کہتی ہے یا میں اس سے کیا کہتی ہوں؟ یہ طے کرنے والے تم کون ہوتے ہو؟“ خشک لہجے میں اس نے مجھے گھورتے ہوئے اس نے کہا۔ ”اور کیا ان باتوں کے لیے یہ وقت مناسب ہے؟“ وہ میری بات سننے پر تیار ہی نہ تھی اور اس کی بدگمانی پر تلملا کے میں نے مزید وقت ضائع کرنا ضروری بھی نہ سمجھا۔

رہ رہ کے مجھے اس پر غصہ آتا رہا۔ اتنے سالوں سے وہ میرے ساتھ تھی کیا اسے میرے کردار اور فطرت کے متعلق کچھ بھی اندازہ نہ ہو سکا۔ کیا اس کی نظروں میں میں اتنا بے اعتبار اور بدکردار شخص ہوں جو وہ کسی اتفاقیہ حادثے کی صورت میں بھی مجھے گویا کبیرے میں کھڑا کر دیتی ہے؟ مجھے گھر میں پھیلنے شادی کے ہنگاموں سے بھی چڑھنے لگی۔ میرا بس نہ چل رہا تھا کہ میں کسی طرح یہ شادی بھی رکھا دوں۔ جس کو میری ذات پر اعتماد نہیں اس کے ساتھ عمر بھر گزارنا کتنا مشکل ثابت ہوگا اس بات کا

اندیشہ مجھے ہولارہا تھا۔

مینو کے ساتھ وہ کس طرح پیش آئی ہوگی اس کا اندازہ مجھے مینو کے کترانے سے بے آسانی ہو گیا۔ اول تو وہ کمرے سے بغیر کسی کے ملائے ٹھٹکی ہی نہ تھی اور چونکہ آج کل گھر میں خاصی رونق تھی شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں اس لیے اسے بھی بار بار کبھی ماما تو کبھی بھائی آواز دے کر باہر نکلنے پر مجبور کر ہی ڈالتیں۔ وہ سب کے درمیان ہوتی تو مجھے ہر ممکن حد تک نظر انداز کرتی۔ میری جانب دیکھنے تک سے گریز کرتی۔ میں جان گیا کہ وہ یہ سب ناز و کے ڈر سے کر رہی ہے۔ پتا نہیں اس نے اس بچی سے کیا کیا نہ کہا ہوگا۔ ”کہیں وہ سب نوکیلے شکوک ظاہر تو نہیں کر دیے جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں.....“ یہ سوچتے ہی میں ایک نامعلوم سی شرمندگی میں دھنس گیا۔ مینو نے نظر تک ملانے کا حوصلہ نہ رہا مجھ میں۔ اس لیے اگر وہ ناز نہیں کے ڈر سے مجھ سے دور دور رہنے پر مجبور تھی تو میری شرمندگی مجھے اس سے پرے دھکیل رہی تھی اور رہی ناز و..... تو اس کی جانب دیکھنے کو یہی میرا جی نہ چاہتا تھا۔ اس نے مجھ پر شک کر کے ایک طرح سے میری ہی نہیں میری اس محبت کی بھی تذلیل کی تھی جو میں اتنے سالوں سے اس سے کرتا آ رہا تھا۔ کاش..... میرے بس میں ہوتا تو میں..... مگر افسوس میں ایسا کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ماما کو دیکھتا، جن کی برسوں کی خواہش پوری ہونے جا رہی تھی تو دل کی اس آواز کو دہالیتا۔ پاپا کو دیکھتا جو بھائی کی دی دے داری سے بالآخر سبکدوش ہونے جا رہے تھے تو اپنے اندر کے طوفان کو اندر ہی دھکیل دیتا۔ میں اتنی آسانی سے گھر کے خوشیوں بھرے ماحول میں زہر نہیں گھول سکتا تھا اور پھر میں اپنی اس حرکت کی وجہ کیا بتاتا۔ اصل بات بتانے میں ذلت ہی ذلت تھی۔ مصلحت کا تقاضا تھا کہ خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا جائے اور میں سبکی کر رہا تھا۔ ورنہ سچ تو یہ تھا

کران دنوں میں ناز نہیں سے حد درجہ متغیر ہو چکا تھا۔

انہی ایک دوسرے سے کترانے، چھپتے چھپاتے دنوں میں مینو ایک بار پھر مجھے پریشان نظر آئی۔ میں چونک گیا۔ اس پلک میں میں اس لڑکے کو تو بھلا ہی بیٹھا۔ کیا جاتا اب بھی وہ رات کو اس کی کٹھڑی پر نکل کر مار کے اسے دہشت زدہ کرتا ہو۔ اگر خدا خواست کسی روز گیت پھلانگ کے اوپر تو چڑھ گیا تو.....؟ اس سے پہلے کہ میں ساری احتیاطیں نظر انداز کرتا ہوا اس سے اس معاملے پر بات کرتا، وہ خود میرے پاس آ گئی۔

”یہ خط..... صاعد بھیا! اس نے آج یہ خط مجھے دیا ہے۔ دیکھیں، کس بڑی طرح دھمکا رہا ہے مجھے۔ بس میں کان نہیں جاؤں گی نہ ہی مار کیٹ۔ نہ میں گھ سے باہر نکلوں گی نہ ہی وہ نظر آئے گا۔ یہ سارا قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔“ اس کے آنسو ایک بار پھر بہہ رہے تھے۔ میں نے اس گندی سی ہنڈ رائٹنگ والے خط پر نظر دوڑائی۔ وہ کوئی عشقہ، مکالموں والا پیار بھرا محبت نامہ کم اور کسی پیشہ ور جرم کا دھمکی نامہ زیادہ لگ رہا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی لکھائی سے اس کے کہ تعلیم یافتہ ہونے کا اور خط کے متن سے اس کی پست ذہنیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔

”جس یار کو لے کر تو اس دن باہر نکلتی تھی اس کی تو میں جان نکال لوں گا۔ وہ ہیرو تو میرے ایک گھونے کی نام نہیں سہہ سکتا۔ اس پر اتنا اڑتی ہے؟ آئندہ ایسے باڈی گارڈ لے کر باہر مت نکلتا۔ اکیلی نکلتا، مزہ تو اکیلے ملنے ہی میں آئے گا۔ سیدھی طرح سے میری محبت کا جواب محبت سے نہ دیا تو مجھے اگلے طریقے بھی آتے ہیں۔ تم میری ہی ہو اور میں تمہیں اپنا بتانے کے رہوں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے کسی کی جان ہی کیوں نہ لینی پڑے۔ تمہاری پانچو تمہارے اس عاشق کی۔“

خط کا اتنا حصہ پڑھ کے ہی میرے اعدا نگارے دھک اٹھے۔

”نہیں..... پلیز! آپ کہیں مت جائیں! کچھ نہ کریں۔“ اس نے مضبوطی سے میرا بازو پکڑ کے مجھے روک لیا اور نہ میں یہ خط لے کر سیدھا صائب کے پاس جا رہا تھا تاکہ اس کی مدد سے اس لفٹ کا اتار پاتا گاؤں۔

”میں نے کہا تھا میں باہر ہی نہیں نکلوں گی۔ پرائیوٹ طور پر پڑھ لوں گی۔ آخر کتنا عرصہ وہ گھر کے باہر کھڑا رہے گا؟ تنگ آ کے خود ہی چھپچھا چھوڑ دے گا۔ پلیز! آپ کچھ مت کیجئے گا۔ اگر میری وجہ سے آپ کو کچھ ہو گیا تو..... تو میں..... پیا..... پیا..... کیا ہوگا۔ میں ان کو کیا جواب دوں گی؟“ وہ سسک پڑی۔

”تمہیں اب بھی اپنی بیا کی پڑی ہے؟“ اس کے تڑپ تڑپ کے رونے پر میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔ ”جبکہ اسے تمہاری کوئی فکر نہیں۔“

”وہ ایسی نہیں ہیں لیکن پتا نہیں کیوں؟“ آج کل ایسا ہی ہو کر رہی ہیں۔ شاید مجھ سے ہی کوئی غلطی ہوئی ہوگی۔ میں نے ان کی باتوں پر ڈھنگ سے عمل نہیں کیا۔ دراصل میں اتنی پریشان تھی اور میری پریشانی کا آپ کے سوا کسی اور کو علم بھی نہ تھا ورنہ میں بیا کی کوئی بات نظر انداز نہیں کر سکتی اور آپ سے دور رہنے کا تو انہوں نے باقاعدہ حکم دیا تھا۔“ اس نے یہ بات اگل ہی دی اور اب کہہ دینے کے بعد پریشان نظر آ رہی تھی۔

”آپ بس یہ بات بھول جائیے مجھے کوئی جھگڑا نہیں کروانا۔ وہ بہت خطرناک شخص لگ رہا ہے۔ اگر اس نے آپ کو کوئی نقصان پہنچایا تو.....“ وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چسپا کے رو دی۔ میں نے اسے دلاسا دینے کے لیے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو اس کا جسم مجھے کھپکپاتا ہوا لرزتا ہوا محسوس ہوا۔ میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ بے تحاشا

ترس آیا مجھے اس نغمی سی ہڈی پر۔

”بس کرو میٹو! اتنا مت رو۔“ میں نے آہستگی سے اسے اپنے قریب کیا۔ میری تسلی پاتے ہی وہ کسی نغمی بچی کی طرح میرے چوڑے سینے سے لگ گئی۔ میں نے اس کے کانپنے و جود کو شفقت سے اپنے بازوؤں میں بھر لیا اور اس کے ماتھے پر پیار کرتے ہوئے کہا۔

”بس بچہ..... نہ..... اب نہیں رونا..... میں تمہارے آنسو نہیں دیکھ سکتا۔“ اس کے بعد کیا ہوا تھا..... کیسے ہوا تھا..... میں ٹھیک طرح سے پتا نہیں سکتا۔ بس ایک دھماکا سا ہوا تھا۔ نظر اٹھائی تو نازنین سامنے تھی..... اور دروازہ کھلا تھا۔

ہچکیاں لے لے کر روتی سرخ آنکھوں اور بکھرے بالوں والی مینو..... اسے بازوؤں میں بھر کے فنی چہرے کے ساتھ کھڑا میں..... اور ہم دونوں کو شرر برساتی نظروں سے گھورتی نازو۔

”پیا..... پیا..... وہ.....“ مینو ہکلاتی ہوئی مجھ سے الگ ہوئی اور نازو کے قریب جا کے اس سے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ نازو کا ہاتھ آگے بڑھا۔ مجھے لگا جیسے وہ آج مینو کو پیٹ ڈالے گی۔ وہ بھی سہم کے ذرا سا پیچھے ہٹی لیکن میرے ساتھ ساتھ اس کی بھی حیرت کی کی انتہائی ندری جب ملنے والے اس بڑھے ہوئے ہاتھ سے اسے اپنی جانب کھینچا اور اپنے ساتھ لگا لیا۔

”بس میری جان! ڈرو نہیں! میں آگئی ہو۔“ اس کے اس دلاسا دیتے فقرے کا مطلب مجھے بڑی دیر سے سمجھ میں آیا اور جب آیا تو میرے جیروں سے زمین کھسک گئی۔

”کس قدر گھٹیا انسان ہو تم صاعدا منظور! ایک بچی کی معصومیت سے کھیلے تمہیں

شرم نہیں آتی۔ اس کی بے ضرر محبت کا غلط فائدہ نہ اٹھاتے ہوئے تمہارے ضمیر نے تمہیں طاقت نہیں کیا؟“

مجھے سننے کا موقع دیے بغیر وہ مجھ پر الزامات عائد کر رہی تھی اور وہ بھی ایسے جن کو سننے سے پہلے میں مر جانا پسند کرتا مگر کیا تم تھا کہ میں زندہ تھا..... اور سن رہا تھا۔ ”نازنین! خاموش ہو جاؤ۔ اتنا مت بلو کہ بعد میں تمہیں شرمندہ ہونے کا موقع بھی نہ ملے۔ تم اصلیت سے ناواقف ہو“ میں نے اسے تنبیہ کی جسے وہ خاطر میں نہ لائی۔

”میں اصلیت سے ناواقف ہوں نہیں..... سچی“ اس نے میرے سامنے آتے ہوئے کہا۔ مینو اس سے چپکے کھڑی پھنی پھنی آنکھوں سے باری باری ہم دونوں کا چہرہ تک رہی تھی۔ ”تمہارا اصل چہرہ دیر سے ہی ایسی مگر میرے سامنے آ چکا ہے۔ جو اتنا گھٹاؤنا اور مکروہ ہے کہ جس کے بارے میں میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ تم اس قدر رنج انسان ہو کہ جس یتیم لڑکی کو تمہارے والدین نے ثواب کی نیت سے گھر میں پناہ دینے کے لیے رکھا“ اس کی پردوش اور سر پرستی کا بیزا اٹھایا۔ تم اسی پر گندہ نظر ڈالنے سے نہیں چوکتے۔“ بے ساختہ میرا ہاتھ بلند ہوا اور نازنین کے منہ سے لالہ بھوکا چہرہ پر اپنا نشان چھوڑ گیا۔ مینو ایک ہلکی سی چیخ مار کے چند قدم پیچھے ہٹی۔ اس نے اپنی ہتھیلی سے اپنا منہ جتنی سے دوبارہ کھا تھا۔ شاید وہ اپنی اندنی جینیں دبانے جا رہی تھی۔

”اپنی بکواس بند کرو۔ تمہارے اندر رشتوں کی شرم اور لحاظ ختم ہو چکا ہے۔“ میرے تھپڑنے اس کے اندر اٹھنے کیلئے قوت دے دھیمہ کر دیا تھا اور اب وہ گال پر ہاتھ رکھے مجھے نہ رہی تھی۔ ”تم نے میرے اور مینو کے تعلق پر ایک ایسا گندہ الزام لگایا ہے جس کو میں کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ مجھے سخت افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے کبھی تمہارے

بسی لڑکی کو چاہا تھا۔ تمہارے جیسی چھوٹی ذہنت کی لڑکی کو..... تمہیں سب سے محترم جانا تھا لیکن آج تم نے مجھے میری نظروں میں نہیں بلکہ خود اپنے آپ کو میری اور اپنی چھوٹی بہن کی نظروں میں گرا دیا ہے۔“

”تو کیا جو کچھ میں نے دیکھا وہ غلط تھا؟“ اس نے تڑپ کے سوال کیا۔

”جو سمجھا وہ غلط تھا..... ارے وہ تو..... وہ تو پریشان تھی اور میں صرف اسے دلا سا دے رہا تھا۔ حالانکہ یہ فرض تمہارا ہے لیکن تمہارے اسی بے لگ اور سخت رویے کا نتیجہ ہے کہ وہ تم سے بے حد انیت رکھنے کے باوجود گھبراتی ہے۔ تم اس کا قریب ترین رشتہ ہو مگر اس کے قریب نہیں ہو۔ تم نے اسے اپنے پروں میں چھپا کے تو پالا ہے لیکن دل سے نہیں لگایا۔ میں جی بے کہ آج اسے اس مشکل میں کسی تیسرے کی مدد حاصل کرنا پڑی میری..... اور میں..... مجھے کیا صلہ ملا اس ہمدردی کا؟ یہ بے ہودہ الزام! کیا اپنے ہاتھوں پال کے بڑی کی ہوئی بچی پر میرا اتنا بھی حق نہیں ہے؟ اگر تم اپنی اس گندہ سوچ کر تھوڑی دیر کے لیے اپنے داغ سے جھٹک دو تو تمہیں نظر آئے گا کہ ایسا کچھ بھی نہیں..... ایسا کچھ بھی نہیں جو معیوب کہلایا جاسکے۔“ میری آواز کی گھن گرج کے پس منظر میں مینو کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ نازو کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔ شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے کچھ بولنے کے لیے منہ کھولا مگر میں نے ہاتھ اٹھا کے اسے روک دیا۔

”بس ہارو..... کچھ مت کہنا۔ اب تمہارے کوئی بھی الفاظ کسی بھی قسم کی معذرت اس داغ کو نہیں دھو سکتی جو تم نے میرے گرد لگایا ہے۔ بہت بایں کیا ہے تم نے..... بہت زار دیا۔ اب مجھے سوچنا پڑے گا کہ کیا میرا نظریہ تمہارا عمر بھر کا ساتھ پر داشت کر سکتا ہے؟“

”نہیں صاعدا!“ اس نے پھر بولنا چاہا مگر میں نے بات کاٹ دی
 ”ایسے انسان کے ساتھ زندگی گزارنا آسان نہیں تاہم مجھ کو! جس کا ساتھ
 آپ کے لیے گالی ہو اور تم..... تمہارے ساتھ گزارا ہر پل مجھے اس گالی کی یاد دلاتا
 رہے گا جو تم نے مجھے دی ہے۔ تمہیں کیا پتا تازہ کی میٹو میرے لیے کیا ہے؟ میں نے
 اسے کبھی تمہاری بہن کی حیثیت سے عزیز جانا تھا اس سے لگاؤ محسوس کیا تھا لیکن وقت
 گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے ان جذبات کا رخ بدلتا گیا“ تازہ دو مہینوں سے سن رہی
 تھی۔ میٹو کے آنسو بھی قہم گئے تھے البتہ اس کا ہاتھ اب تک اس کے ہونٹوں پر جمنا تھا۔
 ”میں..... ہاں نہیں کب اور کیسے..... لیکن میں اسے تمہارے حوالے سے نہیں
 بلکہ اپنی کسی بہت عزیز، ہستی کی طرح اپنے دل میں محسوس کرنے لگا تھا۔ تم اس محبت کو جو
 نام چاہے دے سکتی ہو مگر خدا ارادہ نہیں..... وہ نہیں جو تمہمت کی طرح محسوس ہو۔ یوں
 سمجھو میں نے اسے تمہاری نہیں اپنی بہن کی طرح محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔“
 ”صاعدا! مجھے.....“ تازہ نے شاید معافی مانگنا چاہتی تھی کہ میٹو کے پلٹ کے
 کمرے سے نکلنے پر اسے آواز دے کر روکے گئی۔

”میٹو..... ارکو..... رکھ دو.....“ مگر وہ بھاگتی ہوئی سڑکیوں کی جانب چلی گئی۔
 ”ظہیر تازہ! یہ تو دیکھتی جاؤ“ اس سے پہلے کہ تازہ بھی اس کے پیچھے نکلتی، میں
 نے وہ خط اس کے آگے لہرایا۔ ”یہ ہے اس کی پریشانی کی وجہ..... جس میں تمہیں بھی
 شریک کر کے وہ تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس رات اس کے کمرے میں میں
 اس لیے گیا تھا کہ وہ شخص باہر گیٹ پر کھڑا ہے ہر اسماں کر رہا تھا..... اور کچھ جانتا چاہو
 گی؟“

”میٹو.....!“ تازہ نے اس کے سفید پڑتے لبوں سے یہ نام ادا ہوا۔ اب جا کے اسے

احساس ہوا تھا کہ وہ میٹو کے ساتھ کیا کر بیٹھی ہے۔ چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر منہ بھلا
 کے گھنٹوں کمر اندر کر کے بیٹھنے والی اس کی چھوٹی بہن کا ردِ عمل اس بات پر کیا ہوگا؟ یہ
 سوچ اسے خوف زدہ کر رہی تھی۔

میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس سے ناراض ہو رہا تھا۔ اس پر بگڑ رہا تھا۔ اسے
 بات کی بھی پروا ہوگی۔ یقیناً ہوگی مگر وہ اپنی شرمندگی کا اظہار مجھ سے کرنے کے بجائے
 اگلے قدموں باہر کی جانب لپکی۔

”میٹو.....!“ اس کی پکار میں ایک تڑپ تھی۔ اس کی آواز میں درد اور پچھتاوے
 کا ایسا احساس تھا کہ میں جو چند ٹاپے قبل اس سے جنموں کی خفگی سمیٹے بیٹھا تھا، ایک ہی
 پل میں سب بھلا بیٹھا۔ میرا ردِ وفا ہوا دل اس کی درد میں ڈوبی آواز کی آنچ سے پکسل
 گیا تھا۔ پھر ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ میٹو اس سے روٹی ریتی جو میری نسبت کئی گنا زانوہ
 محبت کرتی تھی تازہ سے..... وہ بھی مان جاتی، صاف کرویتی ناز کی بھول کو۔

لیکن تب..... جب وہ سن پاتی۔ تازہ کو حقیقت جانتے جانتے وہ حقیقت کی
 جانب لوٹ گئی تھی۔ اب کسی کی بھی آواز اس تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ نہ کوئی پکار نہ صدا
 نہ چیخ..... نہ کراہٹ نہ کسی کے مین نہ کسی کا ماتم!



ہے۔ نیند تو بڑی پیاری چیز ہے بڑی مہربان شے یوں اپنی آغوش میں بھر لیتی ہے کہ سونے والا ہر غم ہر دکھ ہر پریشانی سے بے نیاز ہو جاتا ہے جبکہ اس کی پیشانی کی رب ناک ٹکھنوں سے پڑھتی۔ خشک لب بار بار اضطراب سے پھڑ پھڑا جاتا ہے۔ لٹھے سے سفید چہرے پر پسینے کی ہلکی ہلکی بوندیں نظر آ رہی تھیں۔ صاعد نے ہاتھ بڑھا کے اس کے ماتھے اوپر سے سے بکھرے بالوں کی وہ لٹیس پر سے ہٹائیں جو پسینے سے چپک رہی تھیں۔ وہ خطرناک حد تک ٹھنڈی پڑ رہی تھی۔

”وہ تو مر گئی..... اور تم اس دن سے پل پل مر رہی ہو یہ سوچ سوچ کر کہ اس کی موت کی وجہ تمہارا ٹشک ہے۔ تم خود کو سزا دے رہی ہو اس کی روہ سے بھی شرمندہ ہو اور مجھ سے بھی لیکن تم کیا جانو نازو! کہ تمہارے ذہن میں اس ٹشک کا بیج بونے والا میں ہوں۔ بے شک میرے دل نے میں کو نہ سمجھی اس انداز میں دیکھنا نہ سوچا۔ مگر صرف تمہارے ساتھ ایک دل لگی کرنے کو تمہاری توجہ کھینچنے کے لیے میں یہ کر رہی ہوں۔ اس کے بعد حالات مجھ سے پہلے ہی نہ پائے۔ میں نے کتنی کوشش کی لیکن تیرا کمان سے نکال چکا تھا۔ اب تم میری معمول کی حرکتوں کو بھی ٹشک کی نظر سے دیکھنے لگی تھیں اور کسی حد تک ہم دونوں کے ذمے دار ہونے کے باوجود زہن میں آئی تو اس مضمون کی ذات۔“

”وہ..... چلی گئی..... وہ چلی گئی صاعد! میں اسے روک بھی نہ سکی۔“ کسمسا کے وہ انجی اور وحشت زدہ نگاہوں سے آس پاس دیکھتی مدغم آواز میں کہنے لگی۔ ”میں روکتی بھی تو کس منہ سے میں اسے شکل دکھانے کے قابل نہ رہتی تھی..... پھر..... پھر تو مجھے مرنا چاہیے تھا ناں..... وہ کیوں مری؟“ وہ صاعد کا گریبان تھا سے بیجا بی انداز میں سوال کر رہی تھی۔

”میں اس کا سامنا نہیں کر سکتی تھی..... مجھے ہر شکل سے ٹکانے کے لیے وہ اپنی

میں ایک خالی کمرہ ہوں۔
اس کا خالی کمرہ..... جس کو آج دنوں بعد اس کے دو اپنوں نے اس کے دو چاہنے والوں نے آباد کیا ہے مگر پھر بھی یہ آباد آباؤ نہیں لگ رہا۔

”میں ہوں ذمے دار میں قصور دار ہوں اس کی بے وقت موت کا۔ وہ ایک پل کی بددینا تھی نہ میرے دل میں آتی نہ میں ایسا کھیل کھیلتا جس سے نازنین کے ذہن میں شکوک و شبہات جنم لیتے۔ جن کی وجہ سے میں موت کو نگاہ لگانے پر مجبور ہوتی اور اس دن سے لے کر آج تک نازنین کی حالت نہیں سنبھلی۔“

صاعد نے اپنے چہرے پر پھیلے آنسو صاف کیے اور اس کی تصویر کے آگے سے ہٹ گیا۔ اب وہ اس کے بیڈ پر غنوغی کے عالم میں لٹنی نازنین کے پاس جا کھڑا ہوا اور تاسف سے اسے دیکھنے لگا۔ مسکن دوا کے زیر اثر وہ اس وقت ہوش..... نہ بڑھ سکتی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے کہیں سے بھی یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ وہ سدرتی

جان سے گزر گئی صاعد! میں نے اسے مار ڈالا“ اس کی دھیمی سرگوشیاں اب چیخوں میں بدل رہی تھیں۔ صاعد بے چین ہو گیا۔ پیار سے اس کا سر سہلاتے ہوئے وہ اسے بڑے سکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

”ایسا مت کہو نا زو! کون نہیں جانتا وہ تمہارے لیے کیا تھی اور تم اس کے لیے کیا ہو۔ تم اسے کیسے مار سکتی ہو غلطی کس سے نہیں ہوتی، تم سے بھی ہوئی اور اس غلطی کا ذمہ دار کہیں نہ کہیں میں بھی ہوں۔ مجھے یہ احساس کرنا چاہیے تھا کہ بے شک میری نیت میں کھوٹ نہیں تھی لیکن ہمارا رشتہ تو بے حد خطرناک تھا وہ ایسی بے تکلفی کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ شرما اور اخلافا مجھے ایک حد میں رہ کے اس سے اپنا تعلق نبھانا چاہیے تھا۔ وہ تو بچی تھی نا دان تھی، محبت کو ترسی ہوئی، کاش میں ہی محبت سے کام لے لیتا۔ ایسے میں اگر تمہیں کوئی غلط فہمی ہوتی ہے تو وہ مجھ میں فطری ہے..... ہاں بس یہ افسوس عمر بھر رہے گا کہ میں نے ہمیں خلائی کا موقع دیا نہ معافی کا۔ تم بار بار خود کو الزام مت دو نا زو! مجھے تکلیف ہوتی ہے اور اس کو بھی۔“ صاعد نے ایک بار پھر بھگک جانے والی آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... اور نہیں..... اور تکلیف نہیں ہونی چاہیے اسے۔“ وہ بڑبڑائی۔ صاعد نے بے اختیار اس کا سراپے سینے سے لگا لیا اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ نازنین نے کوئی مزاحمت تک نہ کی اور کسی سبھی ہوئی بچی کی طرح اس کے چوڑے سینے میں منہ چھپائے گہرے گہرے سانس لیتی اپنی وحشت کو کم کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

اٹھارہ دنوں کی رفاقت میں یہ ان کی پہلی انتہائی قربت تھی۔ یہ وہ رفاقت نہیں جو کئی سال سے تھی۔ یہ وہ رفاقت تھی جو اٹھارہ دن قبل ہونے والے نکاح نے ان کو عطا کی تھی۔ گھر میں اب تک جو سو گوار ماحول چھایا ہوا تھا اور نازنین کی جو چنی حالت تھی

اس کے پیش نظر یہ فریضہ انتہائی سادگی سے ادا ہوا تھا۔ لیکن یہ بندھن بھی فریقین کو دوبارہ قریب لانے میں نا کام ثابت ہوا تھا۔ ایک طرف نازنین تھی جو اپنی جگہ شرمسار تھی، خود کو صاعد کے قابل نہ سمجھنے کی وجہ سے کھنچی کھنچی رہتی۔ دوسری جانب صاعد تھا جو دل کے چور کے ہاتھوں اس سے نظریں چرائے رہتا۔ اس دوری کی وجہ میں تو کئی بات تھی۔

اور آج..... آج اس قربت کی وجہ بھی میں بنی۔ ایک درد مشترک تھا جو دونوں کو پھر سے باندھ رہا تھا۔ ایک دوسرے کے آنسو پونچھنے کے لیے ہی تھی..... مگر ان کے ہاتھ آگے بڑھ رہے تھے۔

اور میں دیکھ رہا ہوں۔ اس کا خالی کمرہ.....

میری دیران اجڑی ہوئی دیواروں پر جیسے کوئیلیں سی پھوٹ رہی تھیں۔



ایک کمی ہے..... ابھی بھی ایک کمی ہے زمین محمود کی۔

زمین محمود حاضر ہو..... ہو..... !

میری آواز میرے ہی درد و دیار میں گونج کے رہ گئی۔ میری پہلی ہی پکار پر وہ دونوں آگئے تھے۔ شاید یہ ان کے دل کو پکار بھی تھی لیکن میری یہ صدا بے ثمر رہی۔ وہ بھلا کیسے آسکتی ہے۔ وہ تو ان صداؤں سے بہت دور جا چکی ہے۔ جانے والے چلے جاتے ہیں اور پیچھے رہ جاتی ہیں یادیں..... اور وہ چیزیں جو ان کے استعمال میں کبھی رہی تھیں۔

کہتے ہیں چیزیں بے جان ہوتی ہیں۔ بے جان چیزیں بولائیں کرتیں کچھ کہا نہیں کرتیں۔ اگر کہا نہیں کرتیں تو پھر راز کیسے کھولتی ہیں؟ ان چیزوں کو دیکھو یہ کچھ نہ کچھ کہہ رہی ہیں۔ اس ایسپ کی اداس روشنی اس کمپیوٹر کی تاریک اسکرین اس رائٹنگ ٹیبل کی متقل دراز..... اور اس دراز میں رکھی ٹھیکس گلابی جلد والی وہ ڈائری جس کے پہلے ورق پر ”زمین محمود“ لکھا ہے۔

”اگر! بے جان چیزیں۔ بولائیں کرتیں گلابی نہیں دیا کرتیں تو پھر یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اس ایسپ کی مدہم و اداس روشنی وہ ساری آس اور نراس میں ڈوبی ہوئی سرگوشیاں کیوں دہرا رہی ہے؟ اور اس کمپیوٹر کی تاریک اسکرین کے پیچھے گم وہ الفاظ کیوں ابھر کے سامنے آ رہے ہیں جو کسی کے خوابوں کے راز دار تھے؟ وہ آنسو جو کب کے جذب ہو کے خشک ہو چکے تھے وہ ایک بار پھر کیوں اس نیکی کو کم کر رہے ہیں؟۔

اور ہاں اس رائٹنگ ٹیبل کی متقل دراز..... اور اس دراز میں رکھی ٹھیکس گلابی جلد والی وہ ڈائری..... اور اس ڈائری کا وہ ورق..... وہ پہلا ورق جس پر ”زمین محمود“ لکھا ہے۔



ان کے جانے کے بعد..... میں نے اپنا پراس پورا کیا۔ میں بالکل بھی نہیں روئی۔ اب بھی نہیں رو رہی لیکن یہ بہت مشکل ہے صاعد بھیا۔ میرے گلے میں درد ہو رہا ہے۔ مجھ سے کچھ بھی بولا نہیں جا رہا۔ میری آنکھوں میں مریچیں لگ رہی ہیں، جلن ہو رہی ہے ان میں..... میں رو نہیں رہی، بس وہ جلن کی وجہ سے شاید ان میں پانی آ رہا ہے اور گلے میں..... پتا نہیں گلے میں کیا ہے؟ کیوں درد ہو رہا ہے؟ ایسے جیسے کوئی نوکیلا پتھر پھنسا ہو۔ صاعد بھیا! میں آپ سے پراس توڑنا نہیں چاہتی لیکن کیا میں تھوڑا سا رو لوں؟ نہیں! آپ کے جانے کی وجہ سے نہیں! صرف گلے کے درد کی وجہ سے۔ اور وہ جو آنکھوں کی جلن ہے، کیا رو لوں..... بس تھوڑا سا.....!

اس کے بعد کئی صفحے خالی تھے۔ شاید وہ باقاعدگی سے ڈائری لکھنے کی عادی نہ تھی۔ کم از کم وہ کچھ لکھنے کی تو بالکل بھی نہیں جو ڈائری پابندی سے لکھنے کے عادی افراد لکھا کرتے ہیں یعنی اپنے روزانہ کے خاص معمولات اور یاداشتیں۔ کسی کسی صفحے پر کوئی نوٹ، نبر، کہیں کسی کورس کی بک کا نام، کہیں ڈیٹ شیٹ بہت آگے جا کے چند ایک نظمیں اور اشعار لکھے تھے۔ یہ شاید تب کی بات ہے جب وہ اپنے اسکول کے آخری دنوں میں تھی اور اسے اپنی پینا نا زینیں جمو کی کتابیں پڑھنے کا چکا لگ گیا تھا۔ بہت سی کتابوں کو وہ ان کی ضخامت کی وجہ سے ڈر کے مارے ہاتھ تک نہ لگاتی تھی اور کہیں ان کے لیے لمبے مشکل نام اسے خوف زدہ کر دیتے البتہ اس عمر میں اس نے پروین شاکر کی ”خوشبو“ جی بھر کے پڑھی۔ نو عمر البیلہ جذبات کی ترجمانی کرتے آسان فہم زبان میں سیدھے دل میں اترتے اشعار اسے بے آسانی سمجھ میں آنے لگے۔ ایک تو وہ عمر ایسی تھی جس میں دل خود بخود ایسے خیالات کے لیے اپنے بند رو کر دیتا ہے۔ دوسرے وہ نظمیں بھی ایسی ہی تھیں جو شاید انہی کی کچھ پکی راتوں میں لکھی گئی تھیں۔ جا بجا

”صاعد بھیا چلے گئے۔“ یہ وہ پہلا جملہ تھا جو اس ڈائری کے اگلے ورق پر لکھا تھا۔

”اور ان کے جانے کے بعد آج دوسری بار مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں اکیلی رہ گئی ہوں لیکن نہیں..... شاید پہلی بار کیونکہ پانچ سال پہلے بھی میں اکیلی ہوئی تھی لیکن تب میں اس غم کو اس طرح محسوس کرنے کے قابل نہیں تھی۔ مجھے بس اتنا پتا تھا کہ اب میں اپنے ماما پاپا کو کبھی دیکھ نہیں سکوں گی اور یہ کہ اب مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کسی اور کے گھر میں رہنا ہے، کسی دوسرے کے گھر میں۔ اب دنیا میں کچھ بھی ایسا نہیں ہوگا جو صرف اور صرف میرا ہوگا اور یہ احساس مجھے دکھی کرنے کے لیے زیادہ کاری ثابت ہوا لیکن اس بار میں کچھ زیادہ ہی اداس ہو رہی ہوں حالانکہ سب سمجھا رہے ہیں کہ صرف دو سال کی بات ہے۔ دو سال بعد صاعد بھیا پھر سے ہمارے ساتھ ہوں گے۔ صاعد بھیا نے بھی مجھ سے پراس لیا ہے کہ میں نہ تو ان کے جاتے وقت روؤں گی اور نہ ہی

ہوں اور میرے دماغ پر کوئی دباؤ ہے جس کی وجہ سے میرا بخار اتر نہیں رہا۔ سب نے

مجھے رلانے کی کوشش کی لیکن میں تب بھی نہیں روئی۔ کیسے روئی؟ صاعد بھیا سے کیا گیا وعدہ کیسے توڑی؟ جب انہوں نے کہیں اپنا وعدہ نہیں توڑا کبھی میرا دل نہیں دکھایا تو

میں ایسا کیسے کرتی؟ کسی کو کیا پتا صاعد بھیا میرے لیے کیا ہیں۔ یہ بات تو صاعد بھیا بھی نہیں جانتے..... اور کیسے جانیں گے جب میں نے کبھی انہیں بتایا ہی نہیں لیکن اب میں ضرور بتاؤں گی۔ پہلے مجھے سمجھ ہی نہیں آتا تھا انہیں کیسے بتاؤں۔ لیکن اب میں بڑی ہو گئی ہوں اور اتنی کہتی ہوں کہ میں باتیں بھی بڑی بڑی کرنے لگی ہوں۔ پتا کا بھی سبکی خیال ہے کہ اب میں پہلی کی نسبت خاصی سمجھ دار ہو چکی ہوں۔ تو ٹھیک ہے اب میں صاعد بھیا کو یہ بتا سکتی ہوں کہ وہ میرے لیے کیا ہیں؟

وہ میرے لیے ایک ایسا رشتہ ہیں جن کی وجہ سے میں اپنے ماما پاپا کا غم بھلا پائی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ میری زندگی میں ان کا مقام کتنا اہم ہے جو آپ کی سب سے بڑی محرومی مٹا دے وہ غیر اہم تو ہو ہی نہیں سکتا۔

مجھے آج بھی اس گھر میں اپنے ابتدائی دن یاد ہیں۔ اگرچہ بات بہت پرانی میں ہے لیکن چونکہ میں تب خاصی کم عمر تھی اس لیے یہ اچھی طرح واضح نہیں کر سکتی کہ ماما پاپا کے اس حادثے میں گزر جانے کے بعد فوری طور پر میرا رد عمل کیا تھا۔ ظاہر ہے میں جیتی تھی اس عمر میں تو تھی کہ موت کا مطلب سمجھ سکوں ماما پاپا کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہو جانے پر روپیٹ سکوں لیکن اس حادثے سے میں اپنی زندگی کی کتنی بڑی نعمت سے محروم ہو گئی ہوں اس کا صحیح اندازہ جب مجھے نہ تھا۔ یہ احساس اس دن پہلی بار ہوا جب مجھے اور پاپا کو اپنا گھر چھوڑ کے اکل کے گھر آنا پڑا۔ اپنا کمرہ اپنی چیزیں اپنا گھر میں سب کچھ ساتھ لے جانا چاہتی تھی مگر ایسا کر نہ سکی۔ میں ضد کر رہی تھی، بچل

اس کے پسندیدہ اشعار لکھے تھے۔

پھر ایک اور صفحہ تھا جس پر اس نے کچھ لکھا تھا اور عجیب اتفاق تھا کہ یہ جملہ پچھلی تحریر سے کتنا ملتا جلتا تھا۔

”صاعد بھیا آ رہے ہیں۔“ اور بس..... اس کے علاوہ وہاں پورے صفحے پر اور کچھ لکھا نہیں تھا ہاں البتہ..... جا بجا اس نے بال پوائنٹ سے پھول ضرور بنائے تھے۔ چھوٹے چھوٹے پھولوں سے پورا صفحہ بھر پڑا تھا۔ کتنا مکمل اظہار تھا یہ..... ایک نظر ڈالنے ہی اس کے جذبات پوری طرح سمجھ آ جاتے ہیں۔ دو صفحات کے بعد اس نے لکھا تھا۔

”آج میں بہت عجیب سا فیل کر رہی ہوں کچھ کچھ بے چینی کچھ کچھ ایکساٹنٹ..... پتا نہیں کیوں؟ سارا دن مجھے لگتا رہا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ میرا پہلا دھیان صاعد بھیا کی جانب ہی گیا تھا۔ وہی آنے والے تھے۔ انہوں نے ٹھیک تاریخ تو نہیں بتائی، صرف اتنا کہا تھا کہ اسی مہینے کے آخر تک وہ لوٹ آئیں گے۔ ہمیشہ کے لیے۔ شاید وہ اچانک آ کے سر پر اُڑ دینا چاہتے ہیں۔ جب سے انہوں نے فون پر یہ اطلاع دی اسی دن سے میں نے ان کا انتظار شروع کر دیا۔ شکر ہے کہ ایگزاح کے بعد میں آج کل فری ہوں ورنہ اسکول میں بھی سارا وقت میرا دھیان یہیں لگا رہتا کہ کہیں صاعد بھیا گھر نہ آ گئے ہوں۔ ان کے واپس آنے کے بعد سب سے پہلے میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ انہیں بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے ان سے کیا کیا اپنا پراس بالکل بھی نہیں اور کبھی بھی نہیں توڑا۔ کئی بار تو مجھے اتنا رونا آیا تھا کہ لگتا تھا اگر میں نہ روئی تو مر تو ضرور ہاؤں گی لیکن پھر بھی..... پھر بھی میں نہیں روئی۔ ان کے جانے کے فوراً بعد جب میں شدید بیمار ہوئی تب ڈاکٹرز نے کہا تھا کہ میں گھٹن کا شکار

رہی تھی تڑپ رہی تھی۔ میرے رونے پر اور چیخ و پکار کرنے پر اٹکل آنٹی پریشان تو ضرور تھے مگر ان کی آنکھوں میں میں نے وہ بے چینی نہ دیکھی جو میرے آنسو دیکھ کے ماما پاپا کو گھیر لیتی تھی۔ پیامیری ضدیں پوری کرنے کی اپنی ہی کوشش ضرور کرتیں لیکن شاید وہ خود ابھی تک اپنے آپ کو اس گھر میں ایڈجسٹ نہ کر پائی تھیں تو مجھے کیا کرتیں۔ ان کی دوسری مصروفیات بھی کئی تھیں۔ ان کی اسٹریز۔ ماما کی آخری خواہش جان کے وہ ہر حال میں ڈاکٹر بننا چاہتی تھیں۔ اتنی خت پر حاضی کے دوران وہ کسی نہ کسی طرح گھر کے کاموں کے لیے بھی وقت نکال ہی لیا کرتی تھیں تاکہ روڈ اب بھائی کا موڈ بہتر رہے اور کوئی ہم دونوں کو بوجھ نہ سمجھے۔ بس ان کے پاس میرے لیے ہی وقت نہ پڑتا تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ مجھے کتنا پیار کرتی ہیں اور ان دنوں تو زیادہ تو زیادہ ہی کرنے لگی تھیں۔ شاید ماما پاپا کے حصے کا بھی دینا چاہتی ہوں لیکن اس بے پناہ پیار کے باوجود ان کا طرز عمل بہت عجیب سا ہو گیا تھا۔ مجھے ہر وقت ٹوکنی بھی رہتیں۔

”یہ نہ کرو کوئی کیا کہے گا؟ ایسا نہ کہو فلاں کیا سوچے گا؟ یہاں یہ سب نہیں چلے گا اور اب تم ایسا نہیں کر سکتیں۔“ وغیرہ وغیرہ۔ ان کی ہدایتوں کی وجہ سے میں اس گھر اور اس گھر کے رہنے والوں سے اور بھی چنے لگی۔ نہ ہر لگنے لگے مجھے یہ گھر جس میں میں اپنی مرضی سے رہ نہیں سکتی۔ اپنی فرمائش سے کچھ بکواس نہیں سکتی، شور نہیں چلا سکتی..... اور تو اور اس گھر نے میری پیا کو مجھ سے کتنا درد کر دیا تھا۔ میں اور بھی ضدی اور بھی چڑچڑی ہوئی گئی۔ ہاں اچانک نا اچانک جس دن انہوں نے اپنا ہاتھ میرے آگے بڑھایا تھا اس سے ایک دن پہلے تک وہ میرے لیے ویسے ہی تھے جیسے گھر کے باقی لوگ۔ اس لیے میں حیرت سے ان کے بڑھے ہاتھ کو دیکھتی رہی۔ میں نے ایک نظر یہ کے چہرے پر ڈالی۔ میری ضد سے وہ کچھ پریشان نظر آ رہی تھیں لیکن اس وقت میں نے

ان کے چہرے پر اطمینان پھیلنا دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بھی ایک سکون اتر رہا تھا۔ مجھے لگا پیا کی خوشی بھی اس میں ہے کہ میں یہ ہاتھ تمام لوگوں۔ میں نے اپنا ہاتھ صاعد بھیا کے ہاتھ میں دے دیا۔

”ڈن!“ میں نے دوستی کے اس رشتے پر منظوری کی مہر لگا دی اور یہ بیج ہے کہ اس دوستی کی ابتدا میں نے اپنی پیا کو خوش کرنے کے لیے کی تھی۔ مجھے اچانک لگا تھا کہ میری بلا وجہ کی ضد انہیں تکلیف دے رہی ہے اور اگر میں اپنی ضد سے دستبردار ہو جاتی تب بھی وہ دیکھی ہی ہوتیں یہ سوچ کر کہ ایسا شاید میں احتجاجاً یا ناراضی میں کر رہی ہوں۔ مجھے یہ بھی لگتا تھا کہ صاعد بھیا سے میری دوستی پیا کی اپنی خواہش ہے۔ تب تک میں یہ جان چکی تھی کہ وہ بیا کے صرف کزن ہی نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہیں۔ دونوں کی گفتگو ہو چکی ہے۔ آٹھ سال کی عمر میں صرف کزن ہونے اور نگیتر بھی ہونے کا مطلب تو سمجھ آ ہی جاتا ہے۔ مجھے بھی پتا چل گیا کہ صائم بھیا اور صائب بھیا میرے صرف کزن ہیں جبکہ صاعد بھیا کا اس کے علاوہ بھی ایک گہرا رشتہ ہے اس لیے ان سے دوستی کرنے میں کوئی حرج نہیں اور پھر اس دوستی نے یہ بار در کر لیا کہ ان دونوں کے علاوہ ایک تیسرا رشتہ بھی ہے جو ہم دونوں کے درمیان روز بہ روز گہرا ہوتا چلا گیا۔ اس گھر میں مجھے دلچسپی لینے پر مجبور کرنے والے بھی وہی تھے اور اس گھر کے کمینوں کو اپنا بھٹنے میں مدد دینے والے بھی وہی تھے۔ آہستہ آہستہ میں ان کی عادی ہوتی چلی گئی۔ اس سے پہلے میں صرف بیا کے قریب تھی لیکن محبت کے ساتھ ساتھ دوستی کا احساس کیا ہوتا ہے یہ صاعد بھیا کے ساتھ نہ سمجھایا۔ ان سے میں ایسی بہت سی باتیں کر لیا کرتی تھی جو پیا سے کرتے ہوئے جھجکتی تھی۔ ان سے تو اپنی کسی شرارت کا بھی ذکر کرتی تو وہ پریشان ہو کے کہتیں۔

میرادل رکھنے کے لیے نہیں کی تھی یہ میں جانتی ہوں کیونکہ وہ جھوٹ نہیں بولتے مجھ سے تو بالکل بھی نہیں۔ ان کی یہی بات تو مجھے پسند ہے کہ اگر انہوں نے مجھے دوست کہا ہے تو دل سے مجھے دوست مانتے بھی ہیں۔ کبھی کچھ کھانے کی کوشش نہیں کی ہمیشہ ایک ہم عمر دوست کی طرح ٹریٹ کیا ہے۔ اس لیے اگر انہوں نے یہ کہا کہ میرا پنک بلیٹھر ہی ان کی زندگی کا اب تک کا بیسٹ گفٹ ہے تو یقیناً ایسا ہی ہوگا۔

اب وہ آنے والے ہیں۔ انہوں نے بتایا نہیں کہ کب؟ لیکن مجھے لگ رہا ہے جیسے وہ ابھی آ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے رستے میں ہوں۔ اگر اس وقت رات کے ڈھائی نہ بجے ہوتے تو میں ضرور کھڑکی سے نیچے جھانک کے دیکھتی شاید گیٹ پر ہی چلی جاتی لیکن اتنی رات اور اندھیرا..... میں تو ڈر کے مارے پردہ ہٹا کے باہر بھی نہیں جھانک سکتی۔ رات کے اس وقت تک میں اسی لیے جاگ رہی ہوں کہ میرے دل کو یقین سا ہے کہ وہ آ جائیں گے اور اس یقین نے مارے خوشی کے میری نیند تک اڑا رکھے دی ہے۔ دیکھو کل کیا ہوتا ہے؟ اگر واقعی وہ کل آ گئے تو میں تمہیں ضرور بتاؤں گی پیاری ڈائری۔ تم تو بہت اچھی دوست ہو مجھے آج پتا چلا۔ تم سے اتنی ڈھیر ساری باتیں کر کے اندازہ ہوا کہ تم بھی میری دوست بن سکتی ہو۔ اب ہم روز ملا کریں گے۔ روزانہ نہیں تو اکثر کم از کم اس دن تو ضرور جس دن میرے پاس تمہیں بتانے کے لیے بہت سی باتیں ہوں گی۔“

دن اور تاریخ وہ لکھنا بھول گئی تھی یا شاید یہ اس کی عادت میں شامل تھا۔ اس کے اگلے ہی صفحے پر پھر سے کچھ لکھا تھا، صرف اس پر بلکہ اب ایک تسلسل سے یہ تحریریں موجود تھیں۔

”دیکھو..... صاعد بھی آ گئے۔ میرا اندازہ بالکل درست نکلا۔ کل رات میں تم

”کیا کرتی ہو مینو! اگلے آئی کو پتا چلا تو کتنا زرا لگے گا نہیں.....“ اگر کسی چیز کی خواہش یا ضرورت بیان کرتی تو وہ ڈر کے ادھر ادھر دیکھنے لگتیں ”اچھا“ میں کچھ کرتی ہوں مگر مینو گزرا، تم کسی سے کہنا مت تمہیں جو چاہے ہو مجھے چپکے سے بتا دیا کرو کسی کے سامنے مت کہا کرو اٹھا نہیں لگتا۔“

اور میں اپنی ضرورت پر اتنی شرمندہ ہوتی کہ بس..... لیکن صاعد بھیہا کے ساتھ ایسا کچھ نہ تھا۔ ان سے تو مجھے کچھ کہنا ہی نہ پڑتا۔ وہ سن کہے میری ساری خواہشات نہ جانے کیسے بھانپ لیتے تھے۔ انہیں میری پسند نا پسند سب کا پتا ہے۔ وہ میرے لیے بہت ایشل ہیں بہت زیادہ ایشل۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے پر اس کرنے کے بعد میں نے یہ دو سال بغیر روئے کسی نہ کسی طرح گزار دیے ہیں اور ہاں اس میں بیانے بھی میری بہت مدد کی ہے۔ انہوں نے صاعد بھیہا کی کمی پوری کرنے کے لیے مجھے زیادہ وقت دینا شروع کر دیا۔ حالانکہ وہ تو بس وہ ہیں ان کی کمی بھلا کون پوری کر سکتا ہے لیکن عرصے بعد بیا کچھ سے اپنا پکا کے مجھے اچھا لگا۔

میرادل بھلانے کو وہ اکثر مجھ سے صاعد بھیہا کی باتیں کرتی رہتی ہیں تاکہ مجھے خوش ہو اور وقتی مجھے خوشی ہوتی بھی ہے۔ میں سارا دن بھی ان کی باتیں کرتے نہیں تھکتی۔ عجیب سی بات یہ ہے کہ صاعد بھیہا بھی جب میرے ساتھ ہوتے تھے تو زیادہ تر بات وہ بیا کے متعلق ہی کیا کرتے تھے۔ انہیں بیا اچھی لگتی تھی ہاں یہ بات میں جانتی ہوں اسی لیے جب وہ جاپان جا رہے تھے تو میں نے انہیں جوتین گفٹ دیے ان میں سے ایک بیا کی خوبصورت تصویر بھی تھی۔ میرا خیال تھا وہ خوش ہو جائیں گے انہیں میرا یہ گفٹ سب سے زیادہ پسند آئے گا لیکن پتا ہے ہوا کیا؟ انہیں میرا دوسرا والا گفٹ زیادہ پسند آیا یعنی میرا لکھو..... میرے بچپن کا دوست پنک بلیٹھر۔ یہ بات انہوں نے

سے کہہ رہی تھی ناں کہ ایسا لگتا ہے جیسے صاعد بھیا راستے میں ہوں۔ بالکل ایسا ہی ہوا کل رات بے چینی کی وجہ سے مجھے ذرا بھی نیند نہیں آئی اور میں اپنے جاگنگ کے روزانہ کے ٹائم سے خاصا پہلے ہی لان میں نکل آئی۔ ابھی میں نے کوریڈور سے باہر قدم نکالا ہی تھا کہ سامنے صاعد بھیا تھے۔

اُف..... میں بتا نہیں سکتی کہ میں کتنی خوش ہوں۔ ایک تو ان کی واپسی کی خوشی دوسرے اس بات کی کہ مجھے ان کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جیسے ہی مجھے لگا کہ وہ آ رہے ہیں وہ واقعی آ گئے اور ایک خوشی اس بات کی بھی کہ ان سے سب سے پہلے ملنے کی میری خواہش بھی پوری ہو گئی۔ صاعد بھیا ویسے کے ویسے ہیں۔ اتنے ہی لوگ اتنے ہی کیرنگ اتنے ہی فرینڈ لی اور ہاں! اب تو پہلے سے بھی بڑھ کے ہینڈم ہو گئے ہیں لیکن ان کا خیال ہے میں پہلے جیسی نہیں رہی۔ شاید وہ میری شکل و صورت کے بارے میں کہہ رہے ہیں۔ ہاں! یہ ایک طرح سے ٹھیک بھی ہے۔ واقعی دو سالوں میں مجھ میں بہت سی ظاہری تبدیلیاں آئی ہیں۔ یہ بات تو ہر کوئی کہتا ہے میری فرینڈز بھی..... کہ میں زبردست اسٹارٹ اور کیوٹ لگتی ہوں۔ شاید صاعد بھیا کو بھی ایسا لگا ہو لیکن میرا خیال ہے کہ اب بھی انہیں پیاسے بڑھ کے کوئی اچھا نہیں لگتا۔

وہ مجھ سے بات کر رہے تھے آئی بالکل سے مل رہے تھے اور جب چپکے سے پیانماز والا سفید دوپٹا سر اوڑھ کر ان کے دھانے والے کھڑی ہو گئی تو جیسے صاعد بھیا کو اور کچھ نظر ہی نہیں آیا۔ وہ بس انہیں ہی دیکھتے رہے۔ حالانکہ مجھے تو وہ اس طرح دوپٹے کو کانوں اور ناتھے تک لیے کوئی خاص اچھی نہیں لگتیں۔ یہ بات میں نے زویا کو بھی بتائی تھی۔

زویا میری بیسٹ فرینڈ۔ اس نے کہا کہ یہ دل کے معاملے ہیں تم نہیں سمجھو

گی۔ تمہاری بیباک تمہارے صاعد بھیا کے دل میں اتار گئی ہیں اب انہیں ان سے پیارا کوئی لگ ہی نہیں سکتا۔ ہو سکتا ہے وہ ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اگر یہ واقعی دل کی باتیں ہیں تو ظاہر ہے مجھے بھلا کیا پتا ان سب کا۔ زویا کو ضرور پتا ہوگا وہ اپنے ماموں کے بیٹے کو پسند کرتی ہے۔ یعنی وہی دل کا معاملہ..... لیکن جو بھی ہے اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ انسان بس ایک ہی کا ہو کر رہ جائے۔ اسے دوسرے نظر ہی نہ آئیں۔ اس لیے جب صاعد بھیا کی نظریں مسلسل ان کے تعاقب میں رہیں حتیٰ کہ جب وہ کچن میں گھس گئیں تب بھی وہ بے چینی سے وہیں بار بار دیکھتے رہے اور میری باتوں کا غائب دماغی سے ہوں ہاں میں جواب دیتے رہے تو مجھے تھوڑا سا غصہ آیا۔ ہاں بس تھوڑا سا..... زیادہ غصہ تب آیا جب میں نے خود صاعد بھیا کے لیے ناشتا بنانا چاہا اور انہی نے روک دیا یہ کہہ کر کہ ناشتہ صاعد کے آتے ہی کچن میں اس کے پسندیدہ حلوا پوری اور چنے کے ناشتے کی تیاری میں لگ گئی تھی۔ ٹھیک ہے مجھے یہ مشکل چیزیں بنانا نہیں آتیں لیکن میرا دل تو چاہتا ہے ناں صاعد بھیا کو اپنے کچن کی طرف کھلانے کو۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ..... خبر چھوڑ دین میں نے بھی غصے کے مارے ناشتے کی ٹیبل پر پیرا کے محبت سے تیار کیے حلوے چنے اور پوریوں کو نظر اٹھا کے نہ دیکھا۔ بس تو س پر جیم لگا کے کترتی رہی۔ سب نے ہتیرا کہا۔ بلکہ میرا اپنا دل بھی لپکار ہاتھ۔ آخر وہ میری بھی فیورٹ چیزیں تھیں لیکن اُف یہ غصہ.....! پتا نہیں اتنا غصہ کیوں آتا ہے؟



لگتے ہیں۔ ان سے تو خیر کسی کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ صائم بھائی جان کا تو بالکل بھی نہیں اور نہ ہی ایتنا کے اس..... لم ڈھینگ بھائی کا جو کینڈا میں ہوتا ہے۔ کیسے اس کی تصویریں لالا کے شومارتی ہے اور زویا کا وہ کزن جسے وہ پسند کرتی ہے وہ سوکھا سڑا چوزہ۔ پتا نہیں زویا کو اس میں کیا اچھا لگتا ہے؟ میں نے بھی آج خوب شواماری۔

میں اکیڈمی صاعد بھیا کی وہ البمز ساتھ لے گئی تھی جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ ہم سب فرینڈز نے رزلٹ آنے تک کا وقت کارآمد بنانے کے لیے اس اکیڈمی کو چھپد ہی روز قلمی جو ان کیا ہے۔ یہاں ہم کمپیوٹر کورسز بھی کر رہے ہیں اور چند دوسرے کورسز بھی جیسے اختیارات میں فلاور کلینگ کا زویا گلاس ورک کا جب کہ کزنٹی اچھی بیوی کی طرح کو گنگ کلاسز لے رہی ہے۔ ہاں تو میں بات کر رہی تھی ان البمز کی..... جو صاعد بھیا کی شاعرانہ تصویروں سے نئی تھیں۔ زویا اور کزنٹی تو دیکھتے ہی امپرہیں ہو گئیں۔ زویا نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ تمہارے کزن کو دیکھنے کے بعد اب جنید مجھے اچھا نہیں لگے گا۔ جنید اس کا وہ کزن ہے جسے وہ پسند کرتی ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ مذاق میں یہ بات کہہ رہی ہے۔ دل سے تو وہ سچ سچ اس ڈیز ہڈی کے چوزے پر ہی مرتی ہے البتہ اختیارات بڑی اڑ ہے۔ اس کا اب بھی یہ کہنا تھا کہ اس کا بھائی زیادہ پینڈم اور گڈ لکنگ ہے۔ اور پتا ہے اس نے کیا کہا؟ کہنے لگی۔

”اور بائی داوے تم پہ کبھی نمیشن کس لیے کروا رہی ہو۔ میرے بھائی سے کبھی نمیشن کرنا ہے تو اپنے بھائی کا کرواؤ..... اگر زویا کے لور سے کرنا ہے تو مقابلے میں اپنا لورا ڈاؤن میسز کو ہیں؟“ بڑی منہ پھٹ ہے یہ اختیارات۔ میں نے بھی صاف بتایا۔

”یہ میرے ہونے والے جینا ہی ہیں، یعنی بہنوئی۔ اب لاؤ ناں مقابلے پر تم بھی اپنے بہنوئیوں کو؟“ دیکھ رکھے تھے میں نے اس کے کا لے دیو جیسے دونوں بہنوئی، اس

گھر میں رش سالگ گیا ہے۔ میں نے سوچا تھا صاعد بھیا آئے ہیں، ہم خوب مزے کریں گے، گھومیں پھریں گے، ڈنٹ ڈوران ڈور گیمز ہوں گے لیکن وہ تو اتنے مصروف رہتے ہیں ملنے ملانے میں۔ صائم بھائی جان کی فیملی بھی آگئی ہے۔ بچوں کی چھٹیاں ہیں اس لیے شاید کافی دن رہنے کا پروگرام ہے۔ میں تو ان کے آنے اور پھر کئی دن تک رکنے کا سن کر رہی بور ہو گئی ہوں۔ پتا نہیں یہ رد و اب بھائی مجھے اتنی بڑی کیوں لگتی ہیں اور صائم بھائی جان..... ہوں اتنے بڑے نہیں لیکن خاص اچھے بھی نہیں لگتے۔ ویسے تو میرے ساتھ ٹھیک ہیں بلکہ سب کے ساتھ ہی لیکن بھائی سے کتنا ڈرتے ہیں یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں۔ سچی جانتے ہیں کہ وہ کچھ بولنے سے پہلے بھی بھائی کا منہ نکلتے ہیں، بس یہی بات مجھے بڑی لگتی ہے اور پھر وہ کتنے ڈھیلے ڈھالے ست سے ہیں۔ ڈریسنگ بھی ایک دم فضول کرتے ہیں۔

داؤ..... ڈریسنگ تو صاعد بھیا کی غضب کی ہوتی ہے۔ چاہے سوٹ پہنیں، چاہے جینز شرٹ یا چاہے شلوار کرتے..... اور تو اور وہ جاگنگ سوٹ میں بھی کتنے اچھے

پتا نہیں پیا اسے چھپا چھپا کے کیوں رکھ رہی ہیں۔ صاعد بھیا نے تو چھپا کے نہیں دیا، سب کے سامنے ہی دیا تھا۔ چلو مجھے کیا میں نے تو دیکھ لیا ناں چاہے چوری چوری ہی سہی۔ کیا کروں جب میرا دل کوئی کام کرنے کو چاہتا ہے تو میں صبر نہیں کر سکتی۔ دل کی ماننا ہی پڑتی ہے چاہے تھوڑے غلط طریقے سے ہی سہی۔



لیے یہ بات کئی تھی۔ وہ چپ کر کے بیٹھ گئی۔ بڑی آئی صاعد بھیا کے آگے کسی اور کو اچھا کہنے والی۔ وہ صرف دیکھنے میں ہی تو اچھے نہیں ہیں ان کی ساری باتیں ساری عادتیں اچھی لگتی ہیں۔ وہ سب کا خیال رکھتے ہیں سب سے پیار سے بات کرتے ہیں کبھی جھوٹ نہیں بولتے کسی کا دل نہیں دکھاتے، جھوٹے وعدے نہیں کرتے۔ غصہ آ بھی جائے تو اونچی آواز میں چلاتے نہیں ہیں۔ اتنے لائق اور ذہین بھی ہیں..... بلکہ جیننس ہیں جیننس۔

یہ ساری تعریفیں ایک ایک کر کے میں نے ان سب کو بتائیں تاکہ انہیں یقین آ سکے میں صاعد بھیا کو یونہی نبھروں نہیں کہہ رہی، انتظار جل نکڑی تو ”ہونہہ“ کر کے رہ گئی لیکن زویا بڑی عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی پتا نہیں کیوں؟ کل پوچھوں گی بلکہ کل تو میں ان سب کو وہ گفتگو بھی دکھاؤں گی جو صاعد بھیا میرے لیے لائے ہیں تاکہ انہیں پتا چلے ان کی چوائس کتنی اچھی ہے اور دل کتنا بڑا۔ گفتگو تو وہ بھی کے لیے لائے تھے۔ حتیٰ کہ ردو اب بھائی کے لیے بھی لیکن میرے لیے تو ایک ڈیڑھ گھنٹہ گفتگو کا۔ پیا کو انہوں نے بس ایک ہی گفت دیا، بہت چھوٹی سی پیکنگ میں جسے پیا کسی اور کو دکھائے بغیر اپنے کمرے میں لے گئیں۔ سچی سسپنس سے میرا تو برا حال ہو گیا۔ جانتی تھی میں ان سے پوچھوں گی جب بھی نہیں دکھائیں گی۔ دکھانا ہوتا تو بغیر کہے ہی دکھا دیتیں۔ اس لیے میں چپکے سے جا کے دیکھ آئی۔

وہ ایک گولڈ کا بہت پیارا سا برسلٹ تھا۔

اتنا پیارا..... کہ اس کو دیکھنے کے بعد میرا دل چاہا میں اسے پہن کے بھی دیکھوں۔ بھلا میرے ہاتھ میں کیسا لگتا ہے لیکن پیا کے آنے کے ڈر سے میں ایسا نہ کر سکی اور واپس پیک کر کے رکھ دیا۔

بارے میں تمہیں نہیں پتا۔“

”لو بھلا مجھے کیوں نہیں پتا ہوگا۔“

”بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں چاہنے والے دوسروں کو شریک نہیں کرتے۔“ اس نے بڑے تجربہ کار انداز میں بتایا تھا لیکن مجھے ضرور کی ہنسی آ گئی۔

”چاہنے والے.....؟ صاعد بھیا اور خاص طور پر بیا کو“ چاہنے والوں“ کے روپ میں تصور کرنا ہی ایک مضحکہ خیز خیال تھا میرے نزدیک۔ چلو صاعد بھیا کی تو خبر ہے لیکن بیا..... اور ایسے جذبات؟ انہیں پتا چلے اس خطاب کا تو زویا کی زبان ہی کھینچ ڈالیں۔“ میں سوچ سوچ کے ہنسی رہی۔

”اس میں ہنسنے والی کون سی بات ہے۔ وہ فیانی ہیں نازنین ایسا کے اپنا اسٹیشن گفٹ سب کی نظروں سے چھپا کے دیں گے اور دیکھ لینا تمہاری ایسا بھی اسے چھپا کے ہی رکھیں گی۔ کسی کو ہوا نہ لگنے دیں گی۔ اکیلے میں بیٹھ کر دیکھ دیکھ کر مسکرایا کریں گی۔“

”ہاں جیسے یہ بیٹھ کے مسکراتی ہے اور اس کی امی میری ماما کو فون کر کے اس عامل بابا کا پتا پوچھنے لگ جاتی ہیں جو آسب اور جن وغیرہ کو دم کر کے بھگاتا ہے۔“ کنزنی نے لقمہ دیا، وہ سب ہنسنے لگیں لیکن اس بار میں ان کا ساتھ نہ دے سکی۔ مجھے بیا کا اس برہنہ کو چھپا کر رکھنا یاد آ گیا تھا۔ پھر میں نے گھر آتی ہی ان کے کمرے کا رخ کیا۔ میں اچانک اندر داخل ہوئی تھی۔ وہینڈ پر دوسری جانب کروٹ لے لینی تھیں۔ مجھے دیکھ کے انہوں نے تیزی سے اٹھنا چاہا، ان کی گھبراہٹ کو شاید میں سرسری سالیقتی لیکن ایک تو کل میں وہ برہنہ دیکھ چکی تھی، دوسرے زویا کی باتوں کا اثر تھا کہ میری نظر ان کے ہاتھوں کی جانب گئی۔ دراصل مجھے شبہ ہوا تھا وہ کچھ چھپانا چاہتی ہیں اور

جل کے خاک ہو گئیں ساری کی ساری۔ میں بھی اپنے کبھی گفٹس اٹھا کے ساتھ لے گئی تھی۔ سارے کے سارے چاکلیٹس کے ڈبے، مینجے براؤن کے کاسٹیکس، پرفیومز، جری، جیکٹ، جینز، اسکرٹ اور اسٹاکس سی سینڈلز۔ ان تینوں کو بھی میں نے ایک ایک چاکلیٹ اور ایک ایک نیل پالش دے دی۔ اتنے گفٹس تو انہیں کا وہ لم ڈھینگ بھائی مر کے بھی نہ بھیجے۔

”تمہاری ایسا کے لیے کیا لائے تھے؟ کچھ بہت ہی اسٹیشن ہوگا؟“ زویا نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

”ہاں وہ..... نہیں کچھ خاص نہیں، بس یہی کچھ۔“ میں بتاتے بتاتے ٹال گئی۔ مجھے لگا یہ بتانا مناسب نہ ہوگا کہ وہ میرے لیے تو اتنا کچھ لیکن بیا کے لیے بس ایک برہنہ لائے ہیں۔

”کیا.....؟ یہی کچھ امپاسٹیل! ہو سکتا ہے ان کے علاوہ بھی کچھ ہو جس کے

اس سے پہلے کہ وہ اسے اتار کے دوبارہ غائب کرتیں میں نے لپک کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”واؤ..... اتنا خوبصورت بریسٹ! کہاں سے لیا پایا؟“ مجھے امید تھی پوچھنے پر تو وہ ضرور مجھے بتا دیں گی لیکن انہوں نے کہا۔

”اچھا لگا تمہیں؟“

”بہت“ آپ کی کلائی پر ج بھی رہا ہے“ میری تعریف پر وہ لال گلابی ہو گئیں۔
مجھے حیرت ہوئی کہ میں نے ایسا بھی کیا کہہ دیا۔

”میں پہن کے دیکھ لوں پیا!“ بڑے شوق سے میں نے پوچھا لیکن ان کے چہرے پر گھبراہٹ پیدا ہو گئی۔

”ارے تم..... تم کیا کرو گی..... تمہاری اسج کی لڑکیوں پر یہ سوٹ نہیں کرتے۔“
”یوں کہیں“ یہ مہنگا ہے اس لیے آپ کو ڈر ہے میں اسے کھوند دوں یا خراب نہ کر دوں.....“ میں نے منہ بنایا۔ دراصل میں صرف ان سے الگوانا چاہتی تھی کہ وہ بتائیں یہ تھنا نہیں کس نے دیا ہے۔

”یہ کیا کہا تم نے میو؟“ انہیں واقعی دکھ ہوا۔ ”تمہاری اور میری چیز میں کوئی فرق ہے بھلا..... دراصل یہ تو.....“ وہ ہنگامی تھیں بتاتے ہوئے مجھے بھی ترس آ گیا البتہ اس بریسٹ کو ایک بار پہن کر دیکھنے کی خواہش میں دبائے نہ سکی۔

”میں کوئی باہر تھوڑا ہی جاؤں گی۔ بس یہیں پہن کر دیکھوں گی..... پلیز پیا!“
میرے اس بار کہنے پر انہوں نے خود وہ بریسٹ اپنی کلائی سے اتار کے مجھے پہنا دیا۔ میں اپنی اہمیت پر مغروری ہو گئی۔ اگر اس وقت زویا میرے سامنے ہوتی تو میں اسے دکھائی کہ کوئی بھی محبت اتنی اہم نہیں کہ وہ میری پیا کی اپنی منو کے لیے محبت

پر حاوی ہو جائے۔

”اُف“ میری کلائی بج سی گئی اس گولڈ بریسٹ سے۔ میرا دل تریس ہونے لگا کہ کاش پیا اسے مجھے ہی دے دیں۔ ”بالکل فٹ ہے مجھے۔ آپ کو تو پھر بہت ٹائٹ ہوگی۔ آپ کی کلائی کا سائز مجھ سے کچھ زیادہ.....“ میں نے ایک کوشش کی کہ شاید وہ مجھے دے ہی دیں لیکن وہ ان کی کہہ کر کے رکھے کپڑے الماری میں رکھ لگیں۔
میں اس بے نیازی پر سخت چڑ گئی اور اٹھ کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”میو..... رو..... میرا بریسٹ“ پیچھے سے پیا کی گھبرائی گھبرائی آواز سنائی دی لیکن اس بار ان سنی کرنے کی باری میری تھی۔

”بس ابھی آئی..... ایک منٹ“ پیچھے مڑ کے دیکھے بغیر میں نے کہا اور تیزی سے سیزہیاں نیچے اتر گئی۔ شاید پیا حواس باختہ ہو کے میرے پیچھے بھی آتی ہوں لیکن وہ اس رفتار سے سیزہیاں نہیں اتر سکتی تھیں جیسا کہ میں نے انہیں کچھ دیر اور تنگ کرنے کا سوچا تھا۔ نیچے آئی تو کیرم کی محفل گرم تھی اور میری جگہ خالی تھی جسے میں نے بُر کر دیا۔

”یہ..... یہ بریسٹ.....؟“ کیرم کھیلے کھیلے اچانک صاعدا بھیانے چونک کر میرے ہاتھ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو میرا ادھیان بھی اس جانب گیا ورنہ میں تو کیرم کھیلے ہوئے بھول ہی گئی تھی کہ میں ایسا کام کر کے آ رہی ہوں کہ اب پیا کی زبردست سی جھانڈ پڑنا لازمی ہے۔

”اوہ ہاں یہ..... یہ پیا نے دیا ہے۔“ میں نے بے پروائی سے کھیلے ہوئے جواب دیا۔ امید تھی کہ پیا نہ سنی وہی بتا دیں گے۔ آخر وہ میرے دوست بھی تو ہیں لیکن وہ تو چپ کر کے رہ گئے۔

”سنو میو!“ کچھ دیر بعد ان کی آواز آئی۔ ”میں نے تمہارے لیے سب گفٹس

انداز سے لیے تھے۔ ماما کا کہنا تھا تم بڑی ہو گئی ہو۔ عنقریب کالج جانے والی ہو اس لیے ان کے کہنے کے مطابق بہت سی چیزیں اور کامیٹیکس بھی لیے لیکن میں اپنے تصور میں موجود اس ننھی مٹی سی مینوکو بھلا نہ پایا تھا اس لیے وہ فراک اور اسٹنڈ ٹوائز لینے سے خود کو روک نہ سکا۔ اب سوچتا ہوں تمہیں تو بہت غصہ آیا ہو گا وہ سب بے جا چیزیں دیکھ کے کیا تم نے وہ کسی دے دیں۔ میرا مطلب ہے صائم بھائی جان کے بچوں یا کسی اور کو؟“

”واہ میں کیوں دو؟ اگر آپ کو سائز کا دھیان نہیں رہا تو کیا ہوا۔ اس سے تھنے کی قدر و قیمت تو کم نہیں ہو جاتی اور اتنے پیار سے دیے تھے کسی اور کو دینا تھنے کی بھی تو ہن ہے اور اسے دینے والے کی بھی۔ کیا میں ایسا کر سکتی ہوں آپ کے وہ تھنے میں استعمال نہیں کر سکتی تو کیا ہوا وہ ہمیشہ میرے پاس محفوظ رہیں گے۔“

ایسا کہتے ہوئے مجھے بالکل خیال نہیں رہا کہ میری اس بات سے بیجا کامپریشن غلط پڑ رہا ہو گا۔ انہوں نے مجھے جان بوجھ کے تو نہیں دیا تھا میں نے خد کر کے پہنا تھا اور انہیں شک کرنے کی نیت سے وہاں سے بھاگ آئی تھی۔ اب یہ سب لکھتے ہوئے خیال آ رہا ہے کہ صاعد بھائی نے وہ برسلٹ دیکھ کر اور بعد میں میری یہ بات سن کر ان کے بارے میں کیا سوچا ہو گا۔ سچ اتنی شرمندگی ہو رہی ہے لیکن تب یہ خیال ہی نہیں آیا۔ میں تو اس بات پر خوش ہو گئی تھی کہ وہ میری زبان سے یہ یہ سب سن کر بے حد خوش ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں بھلہ لگنے لگی تھیں۔

”تم صرف قدمیں ہی بڑی نہیں ہوئیں باتیں بھی بڑی بڑی کرنے لگی ہو۔“
”واہ! واہ! آگلیمنٹ!“ میں نے صاعد بھیا سے پراس لیا ہے کہ کل وہ بار بچے دن کو مجھے لینے کے لیے اکیڈمی آئیں گے۔ اب دکھاؤں گی اختیا اور ذویا کو ہے کوئی ان سائینڈم۔



آج کا دن بہت عجیب گزرا۔ بہت اچھا بھی اور بہت بُرا بھی۔ آج یہ سی عجیب باتیں بھی ہوئیں جو اچھی میں لگیں اور بُری بھی۔ صاعد بھیا دے کے مطابق مجھے لینے بارہ بجے نہیں آ سکے تھے انہیں انکل کے ساتھ کسی ضروری کام سے جانا تھا۔ صبح ناشتے کے وقت انہوں نے مجھے بتایا تو مجھے بہت غصہ آیا۔ میں ناشتے کی ٹیبل سے ہی اٹھ گئی۔ بے چارے صاعد بھیا میرے پیچھے لپک کر آئے اور کتنی دیر مجھے مناتے رہے یہاں تک کہ میری دین والا ہارن بجایا کے واپس چلا گیا۔

”او“ کے۔ تم مجھے اپنی فرینڈز سے ملوانا چاہتی ہو ناں..... تمہاری دین والا چلا گیا اب بھی اگر اکیڈمی جانے کا موڈ ہو رہا ہے تو آؤ میں چھوڑ آتا ہوں۔ اس بہانے تمہاری فرینڈز بھی میری دید سے مستفید ہو جائیں گی۔“

”کیا ہو جائیں گی؟“ مجھے صرف یہ سمجھ آیا کہ وہ مجھے چھوڑنے جا رہے ہیں باقی کی گاڑی اور دوسرے گزر گئی۔

”جھلی ہو جائیں گی“ وہ ہنستے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر لے جانے لگے۔ باہر نکلتے ہوئے میں نے روداد بہ بھابی کی بات سنی تھی وہ صائم بھائی جان سے کہہ رہی تھیں۔

”صاعد نے مینوکو بہت سرجڑ ہار کاھا ہے۔ اتنے لاڈ تو ہم اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے بھی نہیں اٹھاتے۔ آگے چل کے خود مینوکو کے لیے ہی مشکل ہوگی۔“

میں یہ سن نہیں سکی کہ ان کی بات کے جواب میں کسی نے کچھ کہا تھا یا نہیں؟ اگر کہا تھا تو کیا؟ پیاسے تو مجھے یہ امید نہیں تھی۔ وہ کبھی بھی میرے لیے ذہال نہیں بن سکیں۔ اگر صاعد بھیا کی دوستی نہ ہوتی تو میں کتنی..... ارے میں ایسی باتیں کیوں سوچ رہی ہوں۔ صبح ہی تو صاعد بھیا نے میرے سر پر ہاتھ جھیرتے ہوئے مجھے کہا تھا۔

”ایسی باتوں پر نہ تو کان دھرا کرو نہ ان کو بنجیدگی سے لیا کرو۔“ یہ تب کی بات ہے جب روداد بہ بھابی کی وجہ سے میرا منہ بن گیا تھا۔

کچھ ان کے بھلانے کی وجہ سے اور کچھ بعد میں زویا! انتہا اور کنزئی کی ستائشی نظروں کی وجہ سے میرا موڈ خود بخود اچھا ہو گیا۔ صاعد بھیا بھی ان تینوں سے بہت اچھی طرح ملے۔ راستے میں سے انہوں نے ہم سب کے لیے چاکلیٹس اور جو سر بھی لیے تھے۔

”واقعی یار! بہت پسندم ہیں تمہارے صاعد بھیا! آخر کار انتہا جیسی خود پسند لڑکی بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

”بہت لگی ہیں تمہاری سسر!“ ابھی میں ٹھیک طرح سے خوش بھی نہیں ہوئی تھی کہ کنزئی کی بات پر میری مسکراہٹ سکڑی گئی۔ مجھے حیرت اس بات تھی کہ صرف پیا ہی کیوں لگی ہیں۔ ٹھیک ہے کہ ان کی شادی صاعد بھیا سے ہونے والی ہے لیکن اس کا

مطلب یہ تو نہیں کہ وہ میرے یا کسی اور کے کچھ نہیں لگتے۔ میں بھی تو لگی ہوں جس کا ان جیسا دوست ہے۔

وہ دونوں اپنی اپنی کلاس لینے گئیں تو زویا نے پوچھا۔ ”تم چپ کیوں ہو گئیں؟“
”بس ویسے ہی.....“ میں نے ٹالا۔

”تمہاری ان صاعد بھیا کا کوئی چھوٹا بھائی بھی ہے؟“

”ارے..... وہ جلدیہ چارہ..... اس کا کیا بنے گا؟ ویسے بھی صاحب جیسا بھی ہے صاعد بھیا جیسا دوسرا آپس کوئی نہیں۔ تم زیادہ لاچکی مت بنو۔ شکر کرو اپنے اس پیسل مارکا کنزن پر“ مجھے ہلکی آگئی۔

”میں تمہارے لیے پوچھ رہی ہوں۔ تمہارے انکل؟“ آنٹی اپنے دوسرے بیٹے کے لیے تمہیں بھی تو پسند کر سکتے ہیں۔ تم دونوں ان ہی کی ذمہ داری ہو۔ ان کا کام ہی ہلکا ہوگا۔“

”رہنے دو تم اپنے آئیڈیے..... مجھے ذرا ابھی نہ لگی اس کی بات۔ صاحب میرے ساتھ ہمیشہ اچھا رہا تھا فرینڈ لیکن اس بات پر مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔“ یہ صاحب بیچ میں کہاں سے آ گیا۔ بات تو صاعد بھیا کی ہو رہی تھی اور کوئی بھی ان جیسا نہیں ہے۔“ میں نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی۔

”لیکن وہ تو تمہاری بہن کے منگیت ہیں۔“ زویا نے غصے سے کہا۔

”تو کیا ہوا؟“ مجھے اس کا غصے میں آنا سمجھ نہ آیا۔

”پاگل؟ تم اپنی بڑی بہن کے منگیت کو پسند کرتی ہو۔“

”فضول باتیں مت کرو۔“ یہ توجہ تھا میں انہیں پسند کرتی تھی لیکن جس انداز

میں زویا نے کہا وہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں کوئی انہیں اس طرح تھوڑا ہی پسند کرتی

ہوں۔ یہ میں نے زویا کو بتا بھی دیا۔

”میں کوئی فضول بات نہیں کر رہی۔ تمہارے برائے اندازِ ہر حرکت سے واضح ہوتا ہے کہ یہ صرف پسند ناپسند نہیں بلکہ محبت ہے۔ تم ان سے محبت کرتی ہو زمین!“

اس نے اتنی بڑی بات کہہ دی کہ میں تو مارے حیرت کے کچھ کہہ ہی نہ سکی۔ میری آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔ زویا کی بہت بُری عادت ہے کہ جو اس کے دماغ میں آئے جھٹ سے کہہ ڈالتی ہے سو بے بغیر کہ سننے والے کو کیسا لگے گا، مجھے بھی بہت بُرا لگا۔ رونا یہ سوچ کر آیا کہ اگر یہ بات پیسا یا صاعد بھیا میں نے کسی نے سن لی ہوتی تو وہ میرے بارے میں کیا سوچتے۔ خاص طور پر بیباکی نظروں میں تو میں اب تک ایک بچی ہوں۔ ان کا خیال ہی نہ تھا کہ میں یا میری کوئی دوست اس قسم کی بات سوچ سکتے ہیں۔ حالانکہ اب میں ایسا کی بار سوچنے لگی تھی۔ چپکے چپکے یعنی کہ وہ کون ہوگا جس سے میں محبت کروں گی، جو مجھے چاہے گا۔ زویا کہتی ہے محبت خود بخود ہو جاتی ہے پتا بھی نہیں چلتا۔ میں نے مان لیا کیونکہ وہ اس معاملے میں ہم سب فرینڈز کے تجربے کا رہے۔ ہم تو ابھی تک اپنے خوابوں میں ہی اس انجان آدمی کو دیکھتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ زویا جو بھی کہے وہ ٹھیک ہوگا۔ دراصل جب سے یہ حیند اس کے دماغ پر سوار ہوا ہے اسے ان سب باتوں کے علاوہ کچھ سوچتا ہی نہیں۔ ہر وقت محبت، محبت کرتی رہتی ہے۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو ہاں..... پسند کرتی ہوں صاعد بھیا کو..... اور محبت بھی ہوگی ان سے لیکن یہ والی محبت ہو یہ ضروری تو نہیں۔ محبت تو میں پیاسے کبھی کرتی ہوں اور اس سے بے وقوف زویا سے بھی۔

لیکن اگر وہ بے وقوف ہے تو کیا کبھی بے وقوف ہیں جو میرے بارے میں..... میں نے کہاں ناں آج کا دن ہی عجیب و غریب ہے۔ شام کو صاعد بھیا نے سب کو

جوائے لینڈ لے جانے کا پروگرام بنایا، میں خوش خوش تیار ہو کے نیچے آ رہی تھی۔ جب رو دا بے بھائی کونوں پر کسی سے بات کرتے سنا۔

”بچے تو اپنے بچپن کے ساتھ گھومنے پھرنے جا رہے ہیں۔ ہاں ہاں میں فارغ ہوں۔ ارے نہیں، بس بچے جا رہے ہیں۔ ہمارا کیا کام جو لینڈ میں“ وہ کسی سے کہہ رہی تھیں شاید اپنی بہن امی کی کسی دوست سے۔

”نہیں، مشکل ہے۔ ناز تو شاید ہی جائے۔ نہیں نہیں پابندی تو کوئی نہیں۔ وہ خود ہی لیے دیے رہنے والی لڑکی ہے..... اور کیا..... آج کل کے لڑکے کہاں پسند کرتے ہیں ایسی پردے کی بو..... اور صاعد کو تو اب باہر کی ہوا بھی لگ گئی ہے اور پھر ایک بات اور.....“ ان کی آواز دارانہ انداز میں سرگوشی بن گئی تو میں بے پروائی سے نزدیک سے گزرتے گزرتے آہستہ ہو گئی۔

”وہ جو دوسری ہے ناں..... وہی سر پر میمنو۔ ہر وقت تو وہ گلے کا ہار بنی رہتی ہے۔ تیل اور تیلی کا یہ کھیل ایک دن ضرور آگ پکڑ لے گا۔ ارے پھوڑو کیسی بچی..... کہاں کی بچی! میں تو صرف پانچ مہینے بعد دیکھ کے حیران رہ گئی۔ کیسی انجان ہے کم بخت کی ایک تو خسن دوسرے کم عمری کی معصومیت اور پھر ایسی قربت۔ بہت مشکل ہے صاعد کا چچا۔ ہاں اشاروں اشاروں میں سمجھاؤں گی ناز کو..... بھئی، ہم سے تو کسی کا بڑا دیکھا نہیں جاتا۔“

مجھے ان کی بات پوری طرح کچھ میں نہ آتے ہوئے بھی خاصی حد تک سمجھ آ گئی۔ اتنی تو بہر حال آ گئی کہ کم و بیش وہ بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کر رہی تھیں جو زویا نے کیے تھے۔ ان کی باتیں جہاں مجھے ناگوار گزریں وہاں دل کے کسی کو نے میں جلیبی خوشی بھی پھیل رہی تھی اور وہ اس بات کی کہ ان کے خیال میں پیاسے زیادہ افریکانو

ہوں اور اگر صاعد بھیا کو چٹنا پڑے تو وہ مجھے ہی..... نہیں یہ کوئی اچھی بات نہیں، میں مانتی ہوں..... لیکن اپنی تعریف سننا کے بُرا لگتا ہے؟

اور آج کے دن کی آخری سب سے عجیب بات۔ میں سارا وقت ردو اب بھابی کی باتوں میں ہی الجھی رہی۔ صاعد بھیا نے میری خاموشی اور پریشانی کو نوٹ کیا اور وہ پوچھنے لگے۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ انہیں یہ سب پتا ناٹھیک ہو گا یا نہیں۔ میں پیاسے بھی یہ بات نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہ تو سنتے ہی بے ہوش ہو جائیں۔ میں نے صاعد بھیا سے کہہ دیا۔

”میرا کوئی بھی کلوز فرینڈ نہیں ہے جس سے میں اپنے دل کی سب باتیں بغیر کسی جھجک اور خوف کے کہہ سکوں۔“

”ایسی کون سی باتیں ہیں جو کسی سے شیر نہیں کر پار ہی ہوں۔“

”بس ہی ناں..... بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہر کسی سے شیر نہیں کی جا سکتیں۔“

”کیا تم کسی سے؟“

”اچانک کچھ پوچھتے پوچھتے وہ رک گئے جیسے یہ فیصلہ نہ کر پار ہے ہوں کہ یہ سوال کرنا چاہیے یا نہیں پھر آخر کہاٹھے۔“

”کیا کوئی لڑکا ہے؟“

”ہاں“ بغیر کسی وجہ کے میں نے یہ جواب دیا۔ شاید یوں ہی انہیں چھیڑنے کے لیے مگر جب ان کے چہرے کی جانب دیکھا تو میں ڈر گئی۔ وہ بے حد سنجیدہ تھے۔ انہوں نے مسکرانے کی کوشش بھی کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں گم تھیں اور ماتھے پر بہت سی شکنیں۔ میرا جواب انہیں اس قدر پریشان کر دے گا یہ میں نہیں جانتی تھی۔ اس لیے ان کے اگلے سوال کے جواب میں ایک الگ

ہی کہانی سنا ڈالی۔

”پتا نہیں کون ہے زہر لگتا ہے مجھے۔ اتنا تنک کرتا ہے۔ اسکول کے زمانے سے پیچھا کرتا ہے۔ اب بھی روز گھر کے باہر کھڑا ہوتا ہے اور دین کے پیچھے پیچھے ہانک دوڑاتا رہتا ہے۔ سب لڑکیاں اتنا چھیڑتی ہیں۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے صاعد بھیا۔ پتا نہیں کیوں وہ میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔“

یہ تو میرے اسکول اور اب اکیڈمی میں ہر دوسری لڑکی کا مسئلہ تھا اس لیے یہ جھوٹ بولتے ہوئے مجھے زیادہ سوچنا نہیں پڑا۔ اسکول جاتے ہوئے دو تین بار ایسے چند لڑکوں نے متواتر کئی دن تک میرا پیچھا کرنے اور مجھے متوجہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن میرے لفٹ نہ کرانے پر غائب ہو گئے۔ میری یہ بات سن کے صاعد بھیا اچانک کھٹکھٹا کے ہنس پڑے۔ ان کے چہرے کا سارا تناؤ اور پریشانی ختم ہو گئی۔ وہ اب مجھے تسلی دے رہے تھے۔ بتا رہے تھے کہ یہ ایسی کوئی بڑی بات نہیں ہے مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ اور میں حیرت سے انہیں دیکھتی رہی کہ میرے کسی لڑکے میں انوالو ہونے کا خیال انہیں کتنا مضرب کر گیا۔ کس لیے..... کیوں؟

کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ بیا کی طرح وہ بھی مجھے اب تک ایک بچی سمجھتے ہیں۔ وہ بھی یہ نہیں مان سکتے کہ میں اب اپنی ٹین ایج میں ہوں۔ چند مہینے بعد نہ صرف سوئٹ سکین میں داخل ہو جاؤں گی بلکہ کالج بھی جایا کر دوں گی۔ ایسے خیال اس عمر میں نہیں آئیں گے تو کیا بڑھا پے میں جا کر آئیں گے۔ اپنی دے..... میں نے انہیں مطمئن تو کر دیا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن اگر واقعی کئی مجھے کسی سے محبت ہو جائے تو کیا یہی ری ایکشن ہو گا ان کا۔

اس وقت میں نے زویا کی بڑوڑ دیکھ لی تھی لیکن اب سوچتی ہوں شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھی لیکن اس کی آخری بات..... وہ تو سراسر غلط ہے اس نے کہا تھا۔
”پیار میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جسے سے پیار کرتے ہیں کبھی کبھی اس کے دل کا حال جاننے کے لیے اسے جانا پڑتا ہے اور تم کہہ رہی ہو تمہارے صاعد صاحب کا رنگ اڑ گیا تھا یہ سن کر۔ اس کا مطلب ہے وہ بھی تمہیں..... یہ معاملہ تو بہت سرسریں ہو گیا ہے۔“

”تم بہاری ہو میری بس، فضول انداز سے لگا لگا کر۔“

”نہوتم زین! میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ فکر تو مجھے اس بات کی ہے کہ وہ صرف تمہارے کزن ہوتے تو خیر تھی یہ ایک اچھی خاصی اسٹوری کی شروعات ہوتی لیکن وہ تو تمہارے ہونے والے بہنوئی بھی..... یعنی تمہاری بہن کے منگیتر..... کہیں کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔“

”ارے کیسے ہو گا مسئلہ..... جب کوئی بات ہی نہیں ہے۔“ میں نے غصے سے اسے اور کچھ کہنے سے روک دیا۔

پتا نہیں لوگ اپنے اپنے انداز سے کیوں لگاتے رہتے ہیں۔ اس دن رو دا بہ بھائی ایسا باتیں کر رہی تھیں آج زویا اور تو اور آج پیانے بھی بہت عجیب سا آرڈر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے مجھے صاعد بھیا سے دور رہنا چاہیے۔ میں سب سمجھتی ہوں وہ یہ سب کس لیے کہہ رہی ہیں۔ ضرور رو دا بہ بھائی کی کوئی بات انہوں نے بھی سن لی ہو گی یا وہ جان بوجھ کے سنا گئی ہوں گی۔ ورنہ بیا کو بھلا میری اور صاعد بھیا کی دوستی سے کیا پرابلم ہو سکتا ہے۔ میں ان سے لڑنا چاہتی تھی زور زور سے لڑنا چاہتی تھی آخر وہ ایسی کیوں ہیں؟ سب کی باتیں چپ چاپ سن لینے والی ہر کسی سے دب جانے والی اور پھر

زویا کو آج میں نے ساری بات بتائی تھی۔ دراصل وہ جتنی بھی اوٹ پٹانگ ہو میں ہر بات اسے بتائے بغیر رہ نہیں پاتی تھی۔ وہ میری ہر بات توجہ سے جوتی ہے۔ انہی کو تو بس اپنی کہنے کی عادت ہے اور کنزٹی کو نصیحتیں کرنے کی۔ اس نے تو سنتے ہی شروع ہو جانا تھا کہ۔ ”کیا ضرورت تھی بے کار میں جھوٹ بولنے کی۔ بڑی بات ہے وغیرہ وغیرہ۔“ صرف زویا ایسی ہے جو سمجھ جاتی ہے کہ میں نے کون سا کام کس وجہ سے کیا۔ بعض اوقات تو وہ ایسے ایسے نکتے نکالتی ہے جن کے بارے میں مجھے خود ہی پتا نہیں ہوتا۔ سن کر چاہے غصہ آئے لیکن بعد میں سوچو تو جگ لگتے ہیں جیسے اس کی آج کی بات۔

”نہیں تم نے یہ جھوٹ بغیر سوچے سمجھے، فضول میں نہیں بولا۔ دراصل تم دیکھنا چاہتی تھی کہ کسی لڑکے میں تمہاری انوومنٹ کے بارے میں سن کر تمہارے صاعد بھیا کا ری ایکشن کیا ہو گا۔“

چاہتی ہیں کہ مجھے بھی سب کے آگے دبا دیں۔ انہوں نے کیوں نہیں روداد بہ بھابی کو ایک کے بدلے چار سنائیں۔ کیوں نہیں یہ کہا کہ انہیں نہ صرف اپنی بہن پر بھروسہ ہے بلکہ اپنے مگیت پر بھی مکمل اعتماد ہے۔ ایسا بھی کیا خوف۔ آج میں ان کی وجہ سے بہت ہرٹ ہوئی ہوں۔ اس لیے نہیں کہ انہوں نے مجھے صاعد بھیا سے دور در رہنے کا کہا ہے۔ وہ تو میں جانتی ہوں کہ ان کے دل کی خواہش نہیں دکھ کی بات تو یہ ہے کہ وہ کبھی بھی میرے لیے اسٹینڈ نہیں لیتیں نہ میرے لیے نہ اپنے لیے۔ اب کیا صرف روداد بہ بھابی کو خوش اور مطمئن کرنے کے لیے وہ میری اس پرانی دوستی کو ختم کر دے گی؟ میں ایسا نہیں کروں گی، کبھی بھی نہیں۔ انہیں دب کے رہنا ہے تو رہیں۔ میں ایسی زندگی نہیں گزار سکتی، میرا جودل چاہے گا میں کروں گی۔



زویا نے بھی یہی کہا کہ تم جو کر رہی ہو بالکل ٹھیک ہے لیکن وہ روداد بہ بھابی کو اس کا ذمے دار نہیں سمجھتی۔ اس کے خیال میں یہ بیا کی اپنی سوچ بھی تو ہو سکتی ہے۔
’تم مانو یا نہ مانو مس قسم اٹھا کے کہہ سکتی ہوں کہ تمہرے دل میں کہیں نہ کہیں صاعد بھیا کی محبت ضرور موجود ہے۔ ہو سکتا ہے تم اپنی ضد میں اور صرف مجھے جھوٹا ثابت کرنے کے لیے اپنے دل میں جھانکنا ہی گوارا نہیں کرتیں۔ لیکن مجھے لگ رہا ہے تمہاری پیاری بات جان گئی ہیں اسی لیے خوف زدہ ہو کر تمہیں اپنے مگیت سے دور رہنے کا کہہ رہی ہیں۔“

”ہرگز نہیں! پیا ایسا سوچ ہی نہیں سکتیں۔ وہ ابھی تک مجھے چھوٹی سی بچی سمجھتی ہیں۔ ان کے خیال میں تو مجھے اس محبت پیار، عشق وغیرہ کا مطلب بھی پتا نہیں ہوگا۔“
”تو پھر انہیں اپنے مگیت کی جانب سے ڈر ہوگا۔ ان کا تمہاری طرف جھکاؤ دیکھ کے چونک گئی ہوں گی۔ تم ہی تو بتاتی ہو کہ وہ تمہاری ایا۔ جا۔۔۔ زیادہ کلوز

ہیں۔“

”ہاں..... لیکن..... اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ..... نہیں، نہیں“ میں نے کچھ سوچتے سوچتے زور سے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں دل میں کچھ کچھ زویا سے متفق ہو بھی جاتی تو کوئی چیز مجھے ایسا کرنے سے روک دیتی تھی۔

”اور وہ جو اس دن جو اے لینڈ میں ان کی حالت ہوئی تھی؟“ زویا نے جتایا۔

”اس کی وجہ کوئی اور بھی ہو سکتی ہے۔ پلیز زویا! مجھ سے یہ باتیں مت کیا کرو“ میں نے اس کی منت کی۔ ”مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ ایسا کرو گی تو میں تمہیں کچھ بھی نہیں بتایا کروں گی۔ تم تو عام سی بات میں بھی ایسے ایسے مطلب نکال لیتی ہو۔ پلیز زویا..... اس بارے میں سوچتے ہوئے بھی مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔ آخر وہ میری پیا کے.....“ میں رونے ہی تو لگ گئی حالانکہ دوستوں کے سامنے میں بہت مضبوط بنا کرتی تھی۔

”سوری زمین! لیکن کیا تمہیں نہیں لگتا یہ شرمندگی اور یہ گھبراہٹ کا احساس ہی تمہیں سچ کو ماننے سے روک رہا ہے۔ واقعی یہ پریشانی والی بات تو ہے کہ اپنے ہونے والے بھنوی سے انوالومنٹ کا بیوا جانا لیکن اگر میں بار بار تم سے یہ بات کرتی ہوں تو صرف اس لیے کہ تم آسانی سے فیصلہ کر سکو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔“

”کیا مطلب؟“

”دیکھو اگر تو وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں تو واقعی تمہیں اپنی فیٹنگو دہانا پڑیں گی لیکن پہلے یہ تو دیکھ لو کہ ایسا ہے یا نہیں؟“ اپنی بہن کے بارے میں بناؤ وہ چاہے زبان سے تمہیں نہ بتائیں لیکن تمہیں محسوس تو ہونا چاہیے کہ ان کی فیٹنگو کے بارے میں؟“

میں کافی دیر تک سوچتی رہی۔ مجھے بیا کا ایسا کوئی انداز ایسی کوئی بے ساختگی یاد نہیں آئی جس سے ان کے صاعد بھیا کے لیے کوئی خاص قسم کے جذبات ظاہر نہ ہوتے ہوں۔ میری خاموشی سے زویا نے خود ہی کوئی نتیجہ نکال لیا۔

”اوہ..... اور تمہارے صاعد بھیا؟“

”ہاں شاید..... وہ.....“ میں ٹھیک طرح سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ پرانی باتوں پر نظر ڈالوں تو کچھ ایسی یادیں ذہن میں تازہ ہوتی تھیں جن سے ظاہر ہوتا کہ وہ بیا سے محبت کرتے ہیں۔ مثلاً مجھے درمیان میں لا کے ہلکی ہلکی جھپٹ چھاڑ اور ہنسی مذاق..... لیکن اب جب سے وہ جاپان سے آئے ہیں بہت بدلے بدلے لگ رہے ہیں۔ یہی بات میں نے زویا کو بتادی۔

”اور سب کے ساتھ ان کا رویہ پہلے جیسا ہے لیکن بیا کے ساتھ بدلے بدلے نظر آتے ہیں۔ پتا تو خیر شروع سے ہی نو لٹ کا بورڈ اٹھائے رکھتی ہیں مگر اب وہ بھی بہانے بہانے سے انہیں مخاطب کرنا مذاق کرنا وغیرہ چھوڑ چکے ہیں۔ پہلے میں نے خاص نوٹ نہیں کیا اب تم نے کہا تو یاد آیا ہے۔“

”ابھی تمہیں اور بھی بہت کچھ نوٹ کرنا ہے۔ دیکھو یہ تو پتا چل گیا کہ ان کے درمیان صرف مفقعی کا تعلق ہے کوئی اموشنل انچ منٹ نہیں ہے۔ ایسے میں تمہیں اپنی فیٹنگو پر کوئی ٹھیک نہیں محسوس کرنا چاہیے۔“

پتا ہے حیرت کی بات کیا تھی..... کہ اس بار میں نے اس کی بات پر احتجاج کرنے یا انکار کرنے کے بجائے آرام سے سر ہلا دیا تھا جیسے بات میری سمجھ میں آگئی ہو۔ اس وقت میں نے محسوس نہیں کیا۔ اب لکھتے ہوئے یاد کر رہی ہوں تو حیران ہو رہی ہوں! میں نے ایسا کیوں کیا۔ کیا واقعی میرے اندر ایسی فیٹنگو تھیں جن کے بارے میں

زویا کو تو پتا چل گیا لیکن میں اپنے گلٹ کی وجہ سے خود سے بھی چھپاتی رہی۔

ہاں میں تو زویا کی باتیں لکھ رہی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ مجھے اب غور سے صاعد بھیا پر توجہ دینی چاہیے کہ وہ کیا سوچتے ہیں کیا چاہتے ہیں؟

”بس ایک بار یہ پتا چل جائے کہ کیا وہ بھی تم سے ویسی ہی محبت کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں تو بات ختم..... لیکن اگر ہاں تو پھر مسئلہ کیا ہے، تمہیں اپنی محبت حاصل کرنے کا حق ہے۔ تم کسی سے چھین تو نہیں رہیں بلکہ اگر صاعد بھیا بھی تمہیں چاہتے ہیں تو ان کی شادی تم سے ہونی چاہیے..... نہ کہ تمہارا بیٹا ہے۔“

”اف..... یہ کیسی بات کہہ دی زویا نے! ایسا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ مجھے ایک دم یوں لگا جیسے کسی نے بہت طاقت کے ساتھ مجھے اوپر اٹھال دیا ہو۔

شادی..... اور وہ بھی میری..... صاعد بھیا کے ساتھ۔ ویسے کیا اب مجھے انہیں بھیا پکارنا چاہیے؟ نہیں ناں..... اس لیے کہ زویا کے سامنے چاہے میں انکار کرتی رہوں لیکن آج چپکے سے یہ جان رہی ہوں کہ واقعی میں صاعد بھی..... یعنی صاعد سے محبت کرنے لگی ہوں۔

میرا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے کہیں کوئی سن نہ لے..... لیکن کیسے سنے گا؟ میں نے یہ بات زبان سے تو نہیں کہی۔ صرف لکھی ہے اور کہیں کوئی پڑھ نہ لے۔ بہت چھپا کر رکھتی ہوگی مجھے یہ ڈائری..... اور اپنا دل بھی۔



زویا کا کہنا ہے کہ مجھے یہ جاننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ صاعد کے دل میں کیا ہے لیکن یہ میں کیسے جان پاؤں گی۔ ان سے ملنے بات چیت کرنے پر تو پیانے پابندی لگا دی ہے۔ آج انہوں نے مجھے آواز دے کر بیڈ منٹن کھیلنے کے لیے بلایا مگر میں چاہنے کے باوجود نہ جاسکی۔ حالانکہ کتنا دل کر رہا تھا ان کے پاس جانے کو ان سے باتیں کرنے اور ان کے ساتھ وقت گزارنے کو۔ یہ تو ہمیشہ سے میری خواہش رہی ہے لیکن اب جب میں جان چکی ہوں کہ ان کا ساتھ مجھے کس لیے اچھا لگتا ہے تب سے یہ خواہش اور بھی شدید ہو گئی ہے لیکن مجبوری..... پیانے عجیب مصیبت کھڑی کر دی ہے۔ کہیں زویا کا خیال درست تو نہیں، کہیں واقعی وہ مجھ سے پہلے میرے باصاعد کے دل کے حال سے واقف تو نہیں ہو گئیں؟ اگر ایسا ہے تو میں ان کی پابندیاں ہرگز نہیں مانوں گی۔ صاعد خود مجھ سے پوچھنے آئے کہ میں نے رات کھانا کیوں نہیں کھایا؟ کیرم کھیلنے بچہ کیوں نہیں آئی اور اب بھی روٹی روٹی کیوں کھڑی ہوں۔ میرا دل چاہا، میں

انہیں پیہ کی چالاکیوں کے بارے میں سب بتا دوں کہ کیسے وہ مجھے ان سے دور کر رہی ہیں اور میں ایسا کرنے ہی والی تھی کہ پیانے مجھے دیکھ لیا اور نگلیں زور زور سے آوازیں دینے میں بھی اندر جا کے ان سے لڑ ہی پڑی۔

مجھے نہیں سمجھ آتا آپ کی باتیں۔ کیوں منع کرتی ہیں ہر بات سے..... یہ نہ کرو وہ نہ کرو۔ آخر کیا کیا چھوڑوں میں آپ کی خوشی کے لیے؟“

”بدلتیزی مت کرو میو!“ ہمیشہ میں نے سر جھکا کر ان کی ہر بات مانی تھی آج پہلی بار سوال کیا تو بدلتیزی کا الزام لگادیا۔

”تمہارے بھلے کو کہتی ہوں۔“

”اس میں میرا کیا بھلا ہے کہ میں سب سے کٹ کر کمرہ بند کیے بیٹھی رہوں اور صاعد بھیا کے ساتھ بیٹھنے میں میرا کیا نقصان؟“

”وقت ضائع ہوتا ہے تمہارا۔“ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اصل بات گول کر رہی ہیں۔ ”اپنی اسٹیڈیز پر توجہ دو۔“

”میں سی اسٹیڈیز..... ابھی کالج انٹارٹ ہونے میں پندرہ بیس دن باقی ہیں۔“

”تو میں کیا کروں“ انہیں اپنی ہر بات غلط ثابت ہوتے دیکھ کر غصہ آ گیا۔

”آرام سے بیٹھا کرو بچوں کی طرح کھیل کود مجھے پسند نہیں۔“

”آپ کو پسند کیا ہے؟“ میں نے تنک کر کہا۔ وہ کتنی دیر مجھے غصے سے دیکھتی رہیں پھر چکن کی جانب مڑ گئیں۔ مجھے اتنا زیادہ رونا آیا کہ میں وہیں بیٹھ کے رونے لگی۔ اپنے کمرے میں بھی نہ گئی۔ اچانک صائب وہاں آ گیا اور مجھ سے میرے رونے کی وجہ پوچھنے لگا۔ میں بھری تو بیٹھی تھی فوراً سے بتا بیٹھی۔

”وہاں! تمہیں صاعد سے بات کرنے سے روک رہی ہیں؟ یہ جانتے ہوئے

بھی کہ تم صاعد سے کتنی میٹھ اور کلوز ہو ایسا کیوں کر رہی ہیں؟“

”روداہ بھابی کی وجہ سے۔“

”اوہ..... اب سمجھا لیکن روداہ بھابی کی تو عادت ہے۔ کوئی نہ کوئی پرالم کری ایٹ کرنا۔ کم از کم نازنین بھابی کو ہی عقل سے کام لینا چاہیے۔ وہ تو خاصی سمجھ دار ہیں۔ اچھا تم رومٹ میں صاعد سے بات کرنا ہوں وہ خود سمجھا لگا۔“

”نہیں پلیز! ایسا مت کرنا“ میں گھبرا اٹھی۔ ”تم نہیں جانتے“ پیامیر سے ساتھ کیا کریں گی اگر انہیں پتا چل گیا کہ یہ بات میں نے تمہیں بتائی ہے۔ انہوں نے مجھے سختی سے کسی کو بتانے سے منع کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے میں صاعد سے کہہ دوں گا کہ تمہارا نام نہ لے۔“

”تم کیوں نہیں میرا نام بیچا لیتے میرا مطلب ہے کہ تم صاعد بھیا سے کہنا کہ تمہیں یہ بات خود پتا چلی۔ یعنی تم نے کیا کو مجھے ڈانٹتے ہوئے سنا تھا۔ پلیز، پلیز.....

صائب! ایسا ہی کہنا“ میں نے اس سے پراس لے لیا۔

”او کے او کے! ڈونٹ وری میں ایسا ہی کروں گا۔ اس مسئلے کا حل تو نکلتا ہی چاہیے اور وہ صاعد کے نازنین بھابی سے کھل کر بات کرنے سے نکلے گا۔“

میں اتنا تو جانتی ہوں کہ صاعد بھیا کو یہ جان کر بہت غصہ آئے گا۔ وہ پیار بگڑیں گے بھی..... اور شاید اس بات پر ناراض بھی ہو جائیں کہ انہوں نے ہم دونوں پر شک کیا۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو تو ثابت ہو جائے گا کہ ان کی نظر میں میری حیثیت پیاسے کم ہے۔ وہ ہر بات میں انہیں اہمیت دیتے ہیں مگر یہ تو کل پتا چلے گا۔



سے صاف لگ رہا تھا کہ انہیں یہ سب کتابرا لگ رہا ہے۔ مجھے تو یہ سوچ سوچ کے زیادہ مزہ آ رہا ہے کہ وہ اب مجھے کچھ کہہ بھی تو نہیں سکتیں۔ میں خود سے تو کچھ بھی نہیں کر رہی صاعد ہی مجھے زبردستی اپنے پاس سے اٹھنے نہیں دے رہے۔ ایک بار پیا کے زبردست طریقے سے گھور کے دیکھنے پر میں ڈر کے مارے اٹھنے ہی لگی کہ کہیں وہ سب کے سامنے بھاڑنے نہ لگ جائیں..... لیکن صاعد نے ہاتھ پکڑ کے مجھے اپنے پاس دوبارہ بٹھالیا اور کہنے لگے۔ ”بٹھی رہو یا رات تمہارے بغیر کوئی مزہ ہے۔“

میں بچ بچ مغرور ہو گئی اور پیا..... ان کی حالت دیکھنے والی تھی۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ صاعد کے ہاتھوں میں سے میرا ہاتھ نکال کے مجھے کھینچ کے باہر لے جائیں لیکن مجھے ان کی ذرا پروا نہ تھی۔ اب مجھے ان سے ڈر بھی نہیں لگ رہا تھا۔ نہ ان سے نہ ان کی ڈانٹ اور دھمکیوں سے۔ صاعد کے ہاتھوں میں دبا میرا ہاتھ مجھے بہادر بنا تھا مجھے ہواؤں میں اڑا رہا تھا۔ میں اتنی آسانی سے یہ ہاتھ کسی کو چھڑوانے نہیں دوں گی۔



اور آج پتا چل ہی گیا۔ مجھے فضول میں ڈر تھا کہ وہ میری وجہ سے پیاسے الجھنا پسند نہیں کریں گے۔ ان کی اس حرکت کو نظر انداز کر دیں گے۔

لیکن ایسا نہیں ہوا انہوں نے پیاسے بات کی یا نہیں اس بارے میں تو مجھے ٹھیک سے پتا نہیں لیکن آج سارا دن وہ جان بوجھ کے میرے قریب رہے۔ گھر سے باہر بھی نہیں گئے۔ لگتا ہے صاعد نے پیا کی پابندی کے بارے میں سن کر وہ غصے کے مارے پیا کی پابندی کے بارے میں سن کر وہ غصے کے مارے پیا کو چڑانے کے لیے ایسا کرتے رہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ایسا کرتے ہوئے مجھے یہ احساس دلانا چاہتے ہوں کہ کوئی کچھ بھی کہے ان کی زندگی میں میری یعنی زمیں محمود کی اہمیت کبھی بھی کم نہیں ہو سکتی۔

اف..... میں کتنی خوش ہوں آج۔ انہوں نے پیا کے بجائے میری ساندلی۔ میری خاطر پیا کو چڑاتے رہے اور..... اور پیار وہ واقعی چڑ رہی تھیں۔ ان کے چہرے

یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنی جلد ہی اتنا اچانک یہ سب ہو جائے گا۔ آج کمرہ میں صاعد اور پیا کی شادی کی بات ہو رہی تھی۔ آئی نے ان کی شادی کی بات ہو رہی تھی۔ آئی نے ان کی شادی کی تاریخ طے کر دی ہے بالکل اچانک..... کل تک ایسا ہوا، کمرہ بھی نہیں تھا۔

مجھے صاعد اپنی بچپن سے بہت دور محسوس ہو رہے ہیں۔ دکھ کی بات صرف یہ نہیں کہ ان کی شادی ہونے والی ہے اور میں کچھ نہیں کر سکتی بلکہ دکھ کی اصل بات تو یہ ہے کہ اس پر..... صاعد مجھے خوش نظر آ رہے ہیں۔

ایسا لگتا ہے جیسے یقین ہے کہ وہ پیا سے محبت نہیں کرتے۔ اگر کبھی کرتے بھی تھے تو اب نہیں کرتے۔ میں پیاسے کچھ چھیننا نہیں چاہتی وہ میری بہن ہیں اور میں جانتی ہوں کہ انہوں نے اب تک میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میرا خیال رہا ہے لیکن جو چیز ان کی ہے ہی نہیں وہ انہیں حاصل کرنے

آج زودیا نہیں آئی۔ میں بہت بے چین پھرتی رہی۔ آج اسے بتانے کے لیے میرے پاس بہت کچھ تھا۔ کتنی بار دل چاہا اپنا اور کنزروی اس بارے میں بتاؤں مگر روک گئی۔ وہ یہ بات نہیں سمجھ سکتیں۔ انا مجھے غلط سمجھتیں۔ ان کے نزدیک تو اب بھی صاعد..... صاعد بھیا تھے۔ میرے دوست میرے فرسٹ کزن اور میرے ہونے والے بہنوئی..... اور بس۔ یہ میرا ہی کرایا تعارف تھا مگر تب جب میں بھی انہیں اسی حوالے سے جانتی تھی۔ ابھی میرے دل کی بات خود مجھ پر بھی نہیں کھلی تھی۔ اب اگر انہیں کچھ اور بتاؤں تو چاہیں وہ کیا مطلب نکالیں۔ مجھے ایک بڑی لڑکی نہ سمجھ لیں جو اپنی بہن کے منگیترے..... لیکن اس میں میرا کیا قصور؟ زودیا بالکل ٹھیک ہی تو کہتی ہے کہ اگر صاعد اور پیا ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے بلکہ بچپن میں ہوئی اس منگنی پر خاموشی سے راضی ہیں تو ان کی شادی ہونا ایسا خاص ضروری بھی نہیں۔ کسی پر بھی فرق نہیں پڑے گا اس بات سے نہ صاعد پر..... نہ پیار پر۔ ہاں ان کی شادی سے مجھ پر ضرور فرق پڑے گا کیونکہ میں اب صاعد کے بغیر نہیں رہ سکتی۔



حقوق نہیں ہے۔ جس چیز کے ہونے یا نہ ہونے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ اگر ان کے پاس نہ رہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ وہ تو اتنی بڑی خبر سننے کے بعد بھی ایسے نابل پوز کر رہی ہیں جیسے یہ ان کی زندگی کا نہیں کسی اور کی زندگی کا معاملہ ہو۔ جب انہیں اس کی خوشی نہیں تو پھر نہ ہونے کا غم بھی نہیں ہوگا۔

میں ایسے چپ چاپ آنسو نہیں بہاتی رہوں گی۔ مجھے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا پڑے گا اور خود..... کیونکہ میرے لیے کچھ کرنے والا کوئی بھی اس دنیا میں نہیں ہے۔ مجھے اپنی زندگی کی یہ سب سے اہم خوشی حاصل کرنے کی کوشش خود کرنا ہے اور صرف کوشش ہی نہیں کرنا بلکہ کامیاب بھی ہوتا ہے۔



اب جب میں نے ایک چیز ملے کر لی ہے کہ مجھے اپنی پہلی پہلی محبت سے دستبردار نہیں ہونا، ہرگز نہیں ہونا، کبھی بھی نہیں تو میرے دل کو قرار آ گیا ہے۔ اب صاعد اور پیا کی شادی کی تاریخ مقرر ہونا میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اب گھر میں اس بات کا ذکر مجھے پریشان نہیں کرتا۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ میں ایسا ہونے ہی نہیں دوں گی۔

اور مجھے ایسا کرنے میں مدد دیں گے خود صاعد..... کیونکہ میرا دل جانتا ہے وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ بے شک انہوں نے اب تک یہ بات زبان سے نہیں کہی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مجھے نہیں چاہتے۔ زبان سے تو اب تک میں نے بھی نہیں کہا لیکن کیا میری محبت میں کوئی کمی ہے؟ نہیں ناں..... تو پھر ان کی محبت میں کیسے ہوگی؟ چلو زبان سے نہ سہی اور بہت سی باتوں سے یہ محبت ظاہر ہوتی ہے۔ میری عمر کم سہی لیکن میں اتنی بھی انجان نہیں کہ یہ نہ پہچان سکوں کہ کوئی کسی کا اتنا خیال کیوں رکھتا

ہے؟ اس کو اتنا اہم کیوں جانتا ہے؟ اور اس کے لیے اتنا فکر مند کیوں ہوتا ہے؟ یہ محبت ہی تو ہے۔ اور دیکھنا میں ایک دن صاعد کی زبان سے بھی یہ اقرار کروا کے رہوں گی؟ اس میں زیادہ دن نہیں لگیں گے۔ حالانکہ ہر روز ان کی کسی نہ کسی حرکت سے یہ محبت ظاہر ہو ہی جاتی ہے جیسے کہ آج.....!

آج میں نے پھر اس فرضی لڑکے کا فرضی قصہ چھیڑ دیا۔ دراصل صاعد کی بے فکری مجھ سے دیکھتی نہیں جا رہی تھی۔ وہ اپنی شادی کے معاملے میں اس طرح ری ایکٹ نہیں کر رہے جیسا کہ انہیں کرنا چاہیے۔ پہلے تو میں اس وجہ سے ہمت ہی ہارنے لگی تھی لیکن زویا نے حوصلہ دلایا۔ اس کا کہنا ہے کہ صاعد تمہیں چاہنے کے باوجود صرف اس لیے چپ چاپ یہ شادی کرنے پر تیار ہیں کہ ان کے خیال میں تم نہ صرف اس محبت سے انجان اور لاعلم ہو بلکہ شاید وہ اپنی محبت کو یکطرفہ بھی سمجھتے ہوں گے۔ شاید زویا کا خیال ٹھیک ہو لیکن میں پہل بھی تو نہیں کر سکتی۔ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ بس کسی طرح انہیں یہ احساس ہو جائے کہ میں ان کا بڑا ہوا ہاتھ تھا سنے کو بے قرار ہوں تب شاید وہ بھی ہاتھ بڑھانے میں دیر نہ کریں۔ ان کی اسی محبت کو ابھارنے کے لیے میں نے وہ قصہ دوبارہ چھیڑ دیا یا پھر شاید میں انہیں ایک بار پھر اپنے لیے پریشان دیکھنا چاہتی تھی۔ جب وہ میرے لیے پریشان ہوئے تو مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ اس پریشانی کے پیچھے مجھے ان کی محبت چھپیں ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اسی محبت کو شدت سے محسوس کرنے کی خاطر میں نے ہر ممکن حد تک جھوٹ بولے۔ میں کچھ دیر پہلے ہی ردو اب بھائی کے ساتھ نزدیکی مارکیٹ تک واک کرتی گئی تھی۔ اس بات کا فائدہ اٹھا کے انہیں بتایا کہ اس لڑکے نے سارے راستے میرا پیچھا کیا ہے؟

”اس خبیث کو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا اگر ایک بار بھی میرے ہاتھ لگ جائے

تو..... تم دیکھنا میں اس کا حشر کیا کرتا ہوں جو میری مینو کی آنکھوں میں آنسو لانے کا ذمہ دار ہے۔“ انہوں نے اتنے غصے سے کہا کہ میں تو ہواؤں میں اڑنے لگی۔ صاعد ہی تو وہ شخص ہیں..... اس دنیا میں وہ واحد شخص جو میرے لیے زمین محمود کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کسی سے بھی لڑ سکتا ہے۔

صاعد نے مجھے یہ بھی کہا کہ وہ خود میرے ساتھ مارکیٹ جائیں گے تاکہ جب، لڑکا میرا پیچھا کرے تو وہ اسے دیکھ لیں اور پھر میں نے کل کا پروگرام بنالیا ہے۔ اب کل میں انہیں مارکیٹ لے جاؤں گی۔ اکیلی..... لڑکا تو خیر کیا خاک آئے گا جس کوئی وجود ہی نہیں ہے البتہ مجھے صاعد کے ساتھ کچھ وقت اکیلے گزارنے کا اور موقع مل جائے گا۔

کاش..... کاش یہ وقت وہی وقت ثابت ہو جس میں وہ اپنے دل کا راز مجھ پر ظاہر کر دیں۔ پھر آگے کے مرحلے کتنے آسان ہو جائیں گے۔ یہ ابھی بے شک مجھ پر پابندیاں لگا رہی ہیں لیکن میں جانتی ہوں وہ دل کی بہت ابھی ہیں۔ جب انہیں یہ پتا چلے گا کہ میں اور صاعد ایک دوسرے کو چاہتے ہیں تو وہ ضرور خاموشی سے ہمارے درمیان سے نکل جائیں گی۔ کاش..... کل..... ہاں کل دعا کرنا میری ذمہ داری۔



پیروں تلے زمین نکل گئی۔

”نازدی بی نے صاعد پائی کے کمرے دل گئے ساں۔“ یہ بہت عجیب خبر تھی۔ آج سے پہلے شاید ہی کسی نے انہیں صاعد کے کمرے میں جاتے دیکھا ہو۔ اور اب تو شادی کی تاریخ مقرر ہوتے ہی وہ زیادہ چھپ چھپا کر رہتی ہیں۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں وہ میری شکایت کرنے تو نہیں گئیں۔ صاعد کے کمرے کے اوہ کھلے دروازے کی اوٹ سے میں نے سننے کی کوشش کی۔

پیا کے رونے کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔

”میں ایسا کیوں کروں گی۔۔۔ میں ایسا کچھ نہیں چاہتی یہ شادی میری مکمل رضا مندی اور۔۔۔۔۔ خوشی سے ہو رہی ہے۔“

آنسوؤں کے درمیان انہوں نے کچھ بھینکتے کچھ اٹکتے ہوئے یہ فقرہ کہا اور میرے اندر باہر آگ لگ گئی۔

آج انہیں صاعد پر یہ ظاہر کرنے کا خیال آیا کہ اس شادی میں ان کی رضا اور خوشی شامل ہے جبکہ اتنے سالوں سے وہ اس منگنی کو کسی بوجھ کی طرح لاوے بھر رہی ہیں۔ کم از کم میں نے ان دونوں کے رشتے میں کوئی لطافت اور کسی قسم کی رنگینی محسوس نہیں کی۔ تو کیا میرے ڈر سے وہ پیش قدمی کر رہی ہیں یا پھر مجھے صاعد سے محروم رکھنے کی خاطر؟ اور میں سے وقفہ کل ہی کہہ رہی تھی کہ بیادل کی بہت اچھی ہیں، ہم دونوں کے درمیان سے نکل جائیں گی۔ میں نے اندر جھانک کے دیکھا۔ وہ جس صوفے کے کونے پر تکی تھیں وہیں صاعد بالکل ان کے سامنے کارپٹ پر گھٹنے ٹیکے بیٹھے تھے۔

”ہی تو سارا رونا ہے تم کچھ کہتی ہی نہیں۔“ وہ مسکرا رہے تھے اور مجھے ان کی

آج میں اکیڈمی نہیں گئی اور اچھا ہی ہوا جو نہ گئی۔ صبح آٹھ کھلتے ہی مجھے عجیب سی بے چینی ہو رہی تھی جیسے آج میں گھر سے نکلی تو کچھ نقصان ہو جائے گا۔ وہی تو میں ہوں ہی۔۔۔۔۔ آج کل کچھ زیادہ ہی رہنے لگی ہوں اس لیے چھٹی کر لی۔

بعد میں پتا چلا کہ میری چھٹی جس بالکل درست کام کر رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ صاعد کسی نہ کسی کام سے باہر نکل جاتے، میں تیار ہو کے اپنے کمرے سے نکلی۔ کل انہوں نے ہی مجھے کہا تھا کہ وہ میرے ساتھ مارکیٹ چلیں گے۔ میں بھلا یہ موقع ہاتھ سے کیسے جانے دیجی۔ کمرے سے نکلے ہوئے میں نے سامنے پیا کے کمرے کے بند دروازے کی جانب دیکھا۔ وہ دن کو کمرے میں کم ہی ہوتیں اور آج کل تو مہمانوں کی وجہ سے زیادہ ہی کام ہوتا تھا انہیں۔ پھر بھی نیچے اترتے ہی میں نے احتیاطاً اندر ان سے ان کے بارے میں پوچھا تا کہ اگر وہ لاؤنج میں موجود ہیں تو میں دوسری طرف سے صاعد کے کمرے تک جاؤں۔ لیکن اندر انہوں نے جو بتایا اسے سن کر میرے تو

سے ہم دونوں ہی ہنسیا کرتے ہیں اگر اسے بپا اپنے غصے میں ظاہر کر دیں تو ہمارا کام کتنا آسان ہو جائے گا۔ ہمیں ایک دوسرے کی جانب سے پہلے کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ یعنی کہ ایک آدھ بار بپا کو اور غصہ دلا نا ضروری ہے۔ اور اس کے لیے مجھے ایسی ہی ایک اور پوزیشن پیدا کرنی پڑے گی۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے پلان کر لیا تھا۔ وہیں یعنی اس آنکس کریم پارلر پر جہاں صاعد مجھے لے گئے تھے۔

دراصل مجھے سوچوں میں گم دیکھ کے وہ یہ سمجھے کہ میں بپا کی طنزیہ باتوں کی وجہ سے ڈسٹر ہوں۔ اب میں انہیں کیسے بتاؤں کہ مجھے بپا کی کوئی بات بُری نہیں لگی۔ چاہے غصے اور حسد کے جذبات کے ساتھ ہی کسی لیکن کسی نے مجھے آپ کے حوالے سے سوچا تو سہی۔ مجھے مفرد کرنے کو یہی بات ہے۔ ہاں مجھے برا ضرور لگا مگر ان کا آپ کے پاس آنا۔ آپ کا کان سے مسکرانے کی بات کرنا۔ آپ کی مسکراہٹ صرف میرے لیے مخصوص ہے اس پر صرف اور صرف میرا حق ہے۔ یہ سب باتیں میں ان سے دل ہی دل میں کرتی رہی۔ کاش وہ سن پاتے لیکن وہ تو اپنی طرف سے میرا دل بہلانے اور میرا دھیان بنانے کی کوشش میں مصروف تھے۔

حالانکہ دل تو ان کا بھی دکھا ہو گا بپا کی وجہ سے۔ لیکن ان کی فکر تھی تو میری۔ میری خاطر وہ اپنی فیکٹور چھپا کے ہنس رہے تھے اور مجھے ہنسانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کیا اب بھی مجھے ثبوت چاہیے اور ان کی محبت کا؟

نہیں بالکل نہیں۔ ثبوت کیا میں تو ایمان لائیگی ہوں ان کی محبت پر۔ مگر مسئلہ یہ کہے دلوں میں چھپی اس محبت کی وجہ سے یہ شادی نہیں رک سکتی۔ اسے روکنے کے لیے محبت کو ظاہر ہو کر بتائی پڑے گا۔ ایک دوسرے پر بھی اور گھر کے باقی افراد پر بھی۔ اب میں دیر نہیں ہونے دوں گی۔



مسکراہٹ کانٹوں کی طرح چھ رہی تھی۔ ”کسی کو ایسا بھی نہیں ہونا چاہیے“ کسی سر بستہ راز کی طرح۔ اچھا بتاؤ! کیا کہنے آئی تھیں تم؟“

وہ اتنے پیار سے بات کر رہے تھے کہ میں مرنے والی ہو گئی۔ اب پتا نہیں بپا کیا کہتیں۔ مجھ سے یہ سب سننا اور دیکھنا برداشت نہیں ہوا۔ میں نے دھکے کے ساتھ دروازہ کھولا اور زور زور سے پوٹی اندر داخل ہو گئی۔

”صاعد بھیا! آئیں یہ سودی واپس.....“ کیا جوری ہے کہ ابھی بھی مجھے انہیں بھیا کہہ کر پکارنا پڑتا ہے، کوئی مجھ سے پوچھے کہ کس دل سے۔

میرے اچانک اندر آنے سے بپا کی جو حالت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ شاید ان کا دل چاہے رہا ہو کہ وہ مجھے ابھی مارنا شروع کر دیں۔

”سوری میں سمجھی آپ اکیلے ہیں۔ میں پھر آ جاؤں گی۔“ ڈر کے مارے ان کی جانب دیکھنے کے بجائے میں نے صاعد سے کہا۔

”ایسی کون سی بات ہے جو صرف اکیلے میں..... میرا مطلب ہے کہ میری موجودگی میں نہیں ہو سکتی؟“ اتنی بڑی بات کہہ دی انہوں نے۔ میں تو میں صاعد بھی حیران رہ گئے پھر جلد ہی خود کو سنبھال کے میری طرف آئے۔

”بھئی ہوتی ہیں بگڑی یاروں کے درمیان ایسی سوطر ح کی باتیں“ انہوں نے میرے شانے کے گرد بازو پھیلا یا اور میری ذات خود بخود دُعا اختیار ہو گئی۔ اب میں تن کے پیا کے سامنے کھڑی تھی اور ان کے چہرے کے زاویے بگڑ رہے تھے۔

انہوں نے میرے لیے جیسا بھی بی بی ہو ظاہر کیا اس سے صاعد کا موڈ بھی خراب لگ رہا تھا۔ میں زبردستی انہیں لے کر باہر نکل گئی اور سارے رستے سوچتی رہی کہ بپا کا یہ انتہائی شدید ردِ عمل تو میرے حق میں اچھا ثابت ہو رہا ہے۔ جس چیز کو ظاہر کرنے

نے کھڑکی سے باہر گیٹ کی جانب اشارہ کیا۔ ان کا رنگ ایک دم سرخ ہو گیا۔ انہوں نے مجھے اپنے قریب کر لیا۔ شاید انہیں اس لڑکے سے اس دیدہ دلیری کی توقع نہیں تھی۔ اس سے پہلے جب بھی میں نے اس لڑکے کے من گھڑت قصے سناۓ وہ صرف غصے میں آتے تھے لیکن آج میں نے ان کے چہرے پر فکر بھی دیکھا۔ میں نے بات ہی بہت بڑی کہہ دی تھی۔

رات کے اس پہر..... ایک آوارہ لڑکا..... اور وہ بھی گھر کی جوان لڑکی کے پیچھے..... چار دیواری کے اندر تک چلا آیا۔ ظاہر ہے انہیں پریشان ہونا ہی تھا۔ وہ کتنی دیر کھڑکی کے نزدیک گم غم کھڑے رہے۔ ان کی خشک رنگا ہیں اندھیرے میں اس وجود کو تلاش کر رہیں جو محض میرے ذہن کی اختراع تھی۔ اس وقت مجھے وہ پھر سے بہت اچھے لگے۔ جب جب وہ میرے لیے پریشان ہوتے تھے مجھے یقین ہونے لگتا کہ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔

”مینو! گزیا! اتم..... تم کسی کو اپنے ساتھ یہاں سلاو یا پھر اپنی بیا کے کمرے میں چلی جاؤ۔“

”نہیں بیا کے پاس نہیں..... انہیں کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔ وہ صرف پریشان ہی نہیں ہوں گی بلکہ میری پریشانی کو بھی بڑھا دیں گی۔ انہیں حوصلہ دینا یا مسئلے کا حل نکالنا تو آتا نہیں۔ اتنا سادہ ہے ان کا۔ انا مجھے اور خوف زدہ کر دیں گی۔ گھر سے نکلتا تک بند کر دیں گی۔ آپ پلیز انہیں کچھ مت بتائیے گا۔“

میں نے قسمیں تک دے کر انہیں روکنے کی کوشش کی۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ میرے کہنے پر پیار سے سب کچھ چھپانے والے ہیں یا اپنی من مانی کرنے والے ہیں۔ میں سخت گھبرا گئی۔ اگر بیا کو اس بات کا پتا چل جاتا تو سب کچھ الٹ جاتا۔

کل ڈائری لکھنے کے بعد میں دیر تک سوچتی رہی کہ ایسا کون سا طریقہ ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے صاعد مجھے یہ بتانے پر مجبور ہو جائیں کہ وہ پیارے نہیں بلکہ مجھ سے پیار کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ باقی لوگوں کو بھی یہ بات پتا چل جائے۔ کم از کم بیا تو ضرور جان لیں کہ میں کوئی ان کی دشمن نہیں اور نہ ہی صند میں آ کے ایسا کچھ کر رہی ہوں۔ بلکہ ہم دونوں دل کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ ایسے آدمی سے شادی کرنا پسند نہیں کریں گی جو کسی اور سے محبت کرتا ہے۔ سوچتے سوچتے مجھے ایسا زبردست آئیڈیا سوچا کہ میں صبر نہ کر سکی اور نہ ہی اگلے دن کا انتظار۔ حالانکہ رات کافی ہو چکی تھی لیکن میرے خیال میں یہی اچھا موقع تھا۔ میں نے اپنے بیل فون سے صاعد کے نمبر پر بار بار مس کالز کیں۔ آخر کار وہ اوپر آ گئے۔ بہت گھبرائے گھبرائے اور پریشان لگ رہے تھے۔

”صاعد بھیا! وہ..... وہ لڑکا یہاں تھا..... اوھر..... میں نے خود دیکھا تھا۔“ میں

تھا۔ میں جس مقصد کے لیے یہ جھوٹ بول رہی تھی یعنی صاعد کو اکسانے کی خاطر وہ تو دھڑے کا دھارا ہوتا تھا لپٹا لپٹا کی احتیاطیں اور ڈراوے شروع ہو جاتے۔

”پلیز صاعد بھیا۔“ میں روتے روتے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”تم تو روانہ نہ کرو۔ اپنی بیاہ کے بارے میں کہہ رہی ہو کہ ان کا دل بہت چھوٹا ہے اور خود تم ہمت ہار کے روانہ نہ شروع کر بیٹھی ہو۔ کم آن پائز..... میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔“ وہ مجھے حوصلہ دینے لگے۔ وہ میرے اتنے نزدیک بیٹھے تھے کہ مجھے سب کچھ بھولنے لگا۔ بیاہ کا خوف..... آنسو اپنے جھوٹ..... سب کچھ۔ آف..... کس قدر خوبصورت احساس تھا کاش وہ لمبے کچھ اور طویل ہو جاتے۔ وہ پہلے بھی کئی بار میرے نزدیک بیٹھے تھے۔ پہلے بھی کئی بار انہوں نے میرا سر اپنے سینے سے لگا کے میرے بال سہلائے تھے۔ مگر میں اتنی مدہوش کبھی بھی نہ ہوئی تھی۔ کیسا عجیب وقت تھا وہ بھی۔ کاش میں اس وقت کو کچھ دیر اور روک سکتی..... لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

وہ نہیں ایک بار پھر بیاہ..... جی ہاں نازو بیاہ..... پتا نہیں کیسے انہیں صاعد کے میرے کمرے میں ہونے کا پتا چل گیا۔ ورنہ اس وقت تو وہ نیند میں گم ہوتی ہیں اور جاگ بھی رہی ہوتیں تو جس طرح وہ مجھ سے ناراض ہوتی تھیں اس کے بعد مجھے امید نہیں تھی کہ میرے سواری کرنے سے پہلے وہ میرے کمرے میں قدم بھی رکھیں گی پھر پتا نہیں کیسے وہ یہاں آ گئیں۔ میرے صاعد کے کمرے میں آ جانے سے ہی وہ اتنا سخ پا ہوئی تھیں کہ غصے کے مارے مجھے ڈانٹنے تک کی زحمت نہیں کی تو صاعد کے رات کے اس وقت میرے کمرے میں موجود ہونے پر ان کا کیا حال ہوا ہوگا..... تو یہ حالت دیکھنے والی تھی ان کی۔ بلکہ حالت تو میری بھی خاص اچھی نہیں تھی۔ میری تو انگلیں تک کپکپانے لگیں انہیں دیکھ کے۔ ان کے چہرے پر اتنی سنجیدگی تھی کہ صاعد بھی فوراً پیچھے

ہٹ کے کھڑے ہو گئے۔ شاید انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ بیاہ کو کیا بات اس بُری طرح چھپی ہے۔ ان کا میرے نزدیک ہونا..... اور ان کے ہاتھ کا میرے شانے پر ہونا..... اسی لیے وہ فوراً ہی مجھ سے الگ ہو کے کھڑے ہو گئے۔ مجھے یہ بات بالکل اچھی نہیں لگی تھی۔ ٹھیک ہے کہ اس وقت بیاہ سے میں بھی بہت خوف زدہ ہو گئی تھی مگر..... مگر وہ..... وہ کیوں؟ انہیں ڈرنا نہیں چاہیے تھا۔ بیاہ کے ڈر کے مجھ سے دور ہونا یہ بات مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اگر وہ یونہی بیاہ سے اور دوسرے لوگوں سے ڈرتے رہیں گے تو ہم کبھی ایک نہیں ہو سکیں گے۔ مجھے پیار بہت سخت غصہ آ رہا تھا بہت زیادہ۔ اور میں نے تو تب اس غصے کو پھپھانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ صاعد تو صفائیاں پیش کرنے کی کوشش ہی کرتے رہے اور پھر بیاہ کی لڑی کیلٹی سننے کے بعد غصے میں باہر نکل گئے لیکن میں چپ نہیں رہی۔ خوب بولی تب جب بیاہ دوبارہ سے مجھے ڈانٹنا شروع کیا۔ وہ ایک بار پھر مجھے تنہی سے صاعد سے دور ہونے کا مشورہ دے رہی تھیں۔

”آپ بلا وجہ مجھے ڈانٹتی اور لُٹتی رتی ہیں۔ ٹھک آ چکی ہیں آپ مجھ سے۔“ میں زور سے چلائی تھی اور بھی بہت کچھ کہا میں نے۔ میرے چیخنے چلائے کا ان پر اتنا اثر ہوا وہ بجائے طیش میں آنے کے چپ ہی ہو کر رہ گئیں۔ میں نے جو کیا ٹھیک کیا ٹھیک ہی تو ہے۔ جب انہیں صاعد سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے تو کیا اعتراض ہے ہمارے تعلق پر؟



سے چاہتے ہوں تو میں چپ چاپ ان کی خوشی میں راضی ہو جاؤں گی لیکن وہ تو مجھے
چاہتے ہیں۔ صرف پیا کے ڈر سے اور گھر والوں کے رد عمل کا سوچ کر اس بات کو ظاہر
نہیں کر رہے۔ آخر اتنی پرانی منگنی ہے۔ وہ چپ کر سکتے ہیں مگر میرے لیے خاموش رہ
کے شادی کی یہ تیاریاں دیکھنا ناقابل برداشت ہے۔



میں سخت پریشان ہوں۔ ادھر میں نے اپنے حوصلے بلند کیے اور پیا کے سامنے
زبان کھولی دوسری طرف صاعد نے جانے کیوں ہمت ہار گئے ہیں۔ وہ مجھ سے کھینچے
کھینچے لگ رہے ہیں۔ گھر سے باہر ہی وقت گزارتے ہیں زیادہ تر۔ نہ ان کے
آنے کا پتا چلتا ہے نہ جانے کا اور یہاں میرا دل جلانے کا گھر میں ان کی شادی کی
تیاریاں بھی شروع ہو چکی ہیں۔ میرا دل کر رہا ہے میں اس دن کے آنے سے پہلے مر
ہی جاؤں تو اچھا ہے۔ میں صاعد کو کسی اور کا ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ یہ شادی نہیں ہونا
چاہیے، کبھی بھی نہیں۔ پتا نہیں سارے گھر والے اتنے مگن اور خوش کیوں ہیں؟ کیا
انہیں نہیں لگتا یہ شادی غلط ہے۔ کیا ان کو پیا اور صاعد کا روکھا پیکا انداز نظر نہیں آتا۔
صاعد کا گھر سے غائب رہنا، پیا کا چپ چاپ اداس رہنا نظر نہیں آتا، مجھے تو آتا
ہے..... اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شادی پیا صرف میری ضد میں آ کے کر رہی
ہیں۔ چلو وہ صاعد کے بارے میں سیریس نہیں لیکن بالفرض اگر صاعد بھی انہیں دل

بس بہت ہو گیا کل بیا کو ماہوں بٹھایا جا رہا ہے۔

یعنی چند ہی دن بعد وہ صاعد کی زندگی میں شامل ہو جائیں گی اور میں ان کی زندگی سے باہر۔ ابھی ابھی وہ مجھے صاعد کے آس پاس نہیں دیکھ سکتیں بعد میں کیا کریں گی۔ کیا پتا وہ انہیں لے کر کہیں دور چلی جائیں۔

خیر..... میں یہ سب کیوں سوچ رہی ہوں۔ اگر ان دونوں کی شادی ہوگئی تو اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ میرے پاس رہیں یا دور؟

شادی..... کتنی تکلیف ہوتی ہے یہ سوچ کر بھی۔ اور اس دن کیا ہوا جب کچ مجھے شادی ہو جائے گی۔ نہیں مجھے اتنی جلدی ہمت نہیں ہارنا چاہیے۔ کچھ کرنا چاہیے۔ کچھ تو..... وقت بہت کم ہے میرے پاس۔ صاعد تو اب ملتے ہی نہیں اور مل بھی لیں تو کیا ہوگا۔ وہ تو کچھ کرنے پر آمادہ ہی نہیں۔ اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ رکھا ہے لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی، اگر وہ بھی میرے پاس نہ رہیں گے تو میرے پاس بچتا کیا ہے؟ مجھے تو ان کے علاوہ کوئی اور یاد نہیں جو مجھے اتنا پیار کر سکا ہو یا جسے میں اتنا پیار کر سکوں۔ اب جو کرتا ہے مجھے کرتا ہے۔



آج بیا کو ماہوں بٹھایا جا رہا ہے۔ کر لیں جو کرتا ہے۔ اس کا بونی چاہتا ہے لے۔ اگر بیا ماہوں بیٹھ کے بھتیجی ہیں کہ انہوں نے مجھے ہرا دیا تو ٹھیک ہے ایسا ہی ہو سکتے ہیں۔ دو۔ اگر صاعد سوچتے ہیں کہ وہ مجھے نظر انداز کر لے لیا ہے شادی لے لے سب کو خوش کر سکتے ہیں تو انہیں بھی ایسا ہی سوچنے دو۔

کسی کے بھتیجے یا سوچنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو وہی کروں گی جو میرا دل چاہے گا اور میرا دل چونکہ صرف صاعد کو چاہتا ہے اس لیے میں..... ہاں میں اب بھی اس کو شش میں ہوں کہ کسی طرح یہ شادی رک جائے اور اس کے لیے میں نے ایک پلان بھی سوچا ہے۔ کل ساری رات میں جاگتی رہی اور اس بارے میں سوچتی رہی۔ آخر یہی طریقہ درست لگا۔

میں نے ایک خط لکھا ہے اسی لڑکے کے جانب سے۔ اور اس میں ایسی ایسی باتیں لکھی ہیں کہ جن کو پڑھا کے صاعد یقیناً بھڑک جائیں گے۔ جب بھی ایسا ہوتا ہے

مجھے شدت سے لگتا ہے کہ ان کی محبت ظاہر ہونے والی ہے۔ اگر آج بھی ایسا ہوا تو میں پوری کوشش کروں گی کہ ایک بار وہ یہ بات مان جائیں کہ میں ان کے لیے کتنی اہم ہوں اور ہاں میں نے یہ بھی سوچا ہے کہ اس بار پیا سے چھپ کے نہیں بلکہ خاص انہیں دکھانے کے لیے یہ کیا جائے۔ کیا پتا صاعد کو میرے پاس ایک بار پھر دیکھ کے وہ اور بھی غصے میں آ جائیں اور مارے غصے کے خود ہی اس شادی سے انکار کر دیں۔ ان کو یہ دکھانا ضرور ہے کہ بے شک وہ اس شادی کے لیے جو مرضی کر لیں، محبت تو صاعد مجھ سے ہی کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ وہ زبردستی یہ شادی کر بھی لیں گی تو صاعد کی محبت حاصل نہیں کر سکتیں۔ میں نے آج صبح انہیں صاعد سے ملنے کا کہا تھا یہ ذکر کر کے کہ وہ ان سے ناراض ہیں اور انہیں جا کے منانا چاہیے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ اسی وقت وہاں جانے کا سوچ رہی ہوں گی کیونکہ گھر میں زیادہ تر لوگ باہر ہیں۔ میں ان سے پہلے یہ خط لے کر پہنچتی ہوں۔

آج فیصلہ ہو جائے گا۔ آریا پار.....



میں.....میں.....کیا.....کروں.....کیا.....کروں میں.....کرنے کو اب رہا ہی کیا ہے، سوائے اس کے کہ میں.....ہاں میں یہی تو لڑکتی ہوں۔ یہی ایک وہ کام ہے جس کو کرنے میں اب میرا کوئی فائدہ نہ ملتا ہے ورنہ اس سے پہلے میں نے اپنے فائدے کے لیے جو کچھ بھی کیا اس سے مجھے نقصان ہی ہوا۔ نہ صرف مجھے بلکہ سب کو.....حتیٰ کہ صاعد کو بھی۔

کیا میں کبھی دل سے صاعد کے لیے بُرا چاہ سکتی ہوں مگر میں نے بُرا چاہا ہی نہیں ان کے لیے بُرا کیا بھی ہے۔ میں اپنا یہ قصور معاف نہیں کر سکتی، کبھی بھی نہیں۔ مجھے اس کی سزا ملنی تو چاہیے اور میں وہی کر رہی ہوں۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں ہمیشہ وہی کرتی ہوں جو میرا دل چاہتا ہے۔ میرا دل چاہا صاعد میرے ہوں میں نے اس کے لیے ہر طریقہ آزمایا۔

میرا دل چاہا پیا میرے اور صاعد کے بیچ میں سے نکل جائیں اس کے لیے میں

نے ہر حرکت کی۔ اور اب میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں اپنی اپنی حرکتوں کی وجہ سے خود کو سزا دوں..... ایک کڑی سزا! تو وہ میں دے رہی ہوں۔ کچھ وقت اور گزرے گا اور میری سزا پوری ہو جائے گی۔ بس کچھ وقت اور.....
یہی کچھ وقت ہے جو گزارے نہیں گزر رہا۔ اس کو گزرنے کے لیے ہی میں آج پھر تمہارے سامنے ہوں میری پیاری ڈاڑھی۔

بس اس وقت ایک تم ہو جس کا سامنا کرنے میں مجھے شرم محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ دراصل تم سے میرا شرم یا جھجکا والا کوئی رشتہ ہی نہیں ہے۔ تمہارے سامنے میں ہمیشہ ویسے ہی آئی جیسی میں ہوں۔ پیا کے سامنے میں ویسی آتی ہوں جیسا وہ چاہتی تھیں۔ ان کے نزدیک میں ہمیشہ ان کی چھوٹی، معصوم سی بہن رتی۔ اس لیے میں ویسی ہی رہی جیسا ان کے ذہن میں میرا تصور تھا۔

بس ایک تم ہو جو مجھ سے واقف ہو اس لیے میں تمہارے سامنے ہوں۔ کسی اور کا سامنا کرنے کی اب مجھ میں ہمت نہیں ہے اس لیے میں ان سب سے دور جانا چاہتی ہوں۔ میں ایسا نہ کروں تو کیا کروں؟ اپنی نظروں میں تو گر رہی چکی ہوں! کسی اور کی نظروں میں کیسے گرتا دیکھوں خود کو.....؟

مجھے وہ منظر بھلائے نہیں بھولتا: جب میں ساعدہ نے کمرے میں تھی اور پیا چائیک اندر آ گئیں۔ اگرچہ مجھے ان کے آنے کی امید تھی اور اسی وجہ سے میں ساعدہ کے اتنے قریب بھی تھی لیکن جیسے ہی وہ آئیں اور ان کے چہرے پر ہم دونوں کو دیکھ کے جو تاثرات ابھرے انہوں نے مجھے بے حد ڈرا دیا۔ مجھے تب احساس ہوا کہ میں کتنا بڑا قدم اٹھا چکی ہوں۔ گھر میں کچھ مہمان بھی ہیں کل مہندی کی تقریب ہے۔ کوئی بڑا ہنگامہ بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔ پیا ناکامی کے خوف سے کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ ڈر کے مارے

میں ساعدہ کے پاس سے بٹی اور بھاگ کے پیا کے پاس گئی۔ میں نے سوچا انہوں نے یہ تو اندازہ کر ہی لیا ہے کہ ہم دونوں اصل میں ایک دوسرے کو کتنا پیار کرتے ہیں اب ان سے سو رہی کر کے اور اپنی شرمندگی کا اظہار کر لے تم ازلم ان کا غصہ ہی لم کرنے کی کوشش کی جائے لیکن میں حیران رہ گئی جب مجھے ڈانٹنے کے بجائے انہوں نے مجھے اپنے بازوؤں میں بٹھینچ لیا۔ ان کی مضبوط گرفت میں دیا میرا وجود کا پتہ رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کیا کرنے والی ہیں؟ اور پھر اگلے لمحے یہ بھی پتا چل گیا۔

”تم کس قدر گھٹیا شخص ہو ساعدہ!“ میں ان کی نفرت میں ڈوبی آواز سی اور میرے جھونے آنسو سا کتے ہو گئے۔ ”ایلی بچی کی مسمومیت سے بھیتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔“

انہوں نے ساعدہ پر یہ الزام اکایا اسے ان کے لیے تپائی۔ ”پیا میں..... میں“ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر انہوں نے مجھے چپ کر دیا۔ ”تم خاموش رہو۔ کچھ نہیں کہتیں تم اس لیے میں تمہیں منع کرتی تھی کہ اس سے دور رہو۔ تم اس لیے اس لیے جان نہیں پارتی تھیں ایلیان مجھے اندازہ ہو گیا تھا صرف یقین نہیں آ رہا تھا آج وہ جی آ گیا۔ یہ ہے اس کا اصل چہرہ۔ گھٹا و نا اور مکروہ چہرہ! جسے نہ رشتوں کی شرم سے نہ ہی خدا کا خوف۔ جو یتیم لڑکی اس گھر میں اس لیے رہتی ہے کہ اسے اسے تمہارے والدین نے اپنی سرپرستی میں لیا ہے اس کے تحفظ کے ضامن بنے ہیں وہ..... تم اس پر بڑی نظر..... ابھی میں ان کے غلط اندازوں پر ہی گھبرا رہی تھی کہ ساعدہ نے پیا کے چہرے پر اپلا زور دیا تھپڑ مار کے میری جان ہی نکال دی۔ یہ سب جو ہو رہا تھا یہ وہ نہیں تھا جو میں چاہتی تھی۔ وہ دونوں میری وجہ سے ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے اس بڑی طرح سے بھٹک رہے تھے۔ مجھے

تکلیف ہو رہی تھی۔ صاعد سے تو میں محبت کرتی ہی ہوں۔ پیار سے اپنی محبت کو بھولنے لگی تھی میں..... اور اب ان کو لگنے والے تھپڑ پر اپنے دل کی تکلیف نے مجھے احساس دلایا کہ میں اب بھی انہیں چاہتی ہوں۔ جس طرح صاعد پر لگائے گئے ان کے بے بنیاد الزام پر مجھے تکلیف ہوئی تھی، ایسے ہی صاعد کے ان کو مارے تھپڑ پر بھی ہوئی تھی۔ میرے چہرے پر پرہیز والے آنسو اب سچے تھے۔

”اپنی بکواس بند کر دو۔ شرم نہیں آتی تمہیں میرے اور رینو پر ایسا گند الزام لگاتے ہوئے۔“ وہ پہلی بار پیار کے سامنے اتنی اونچی آواز میں بول رہے تھے۔ ”مجھے یہ سوچ کر افسوس ہو رہا ہے کہ کبھی میں نے تمہیں چاہا تھا۔ تمہیں سب سے الگ سب سے محترم چاہا تھا۔“ میں کانپ کے رہ گئی۔

صاعد پیار کو چاہتے ہیں اس بات کا سننا میرے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ اس سے بھی زیادہ جتنا پیار کا ان پر الزام لگانا۔ جب پیار نے صاعد پر الزام لگایا تو مجھے احساس ہوا کہ کیا اب بھی میرے بارے میں کچھ غلط نہیں سوچ سکتیں۔ میں نے سوچا تھا ہمیں ایک ساتھ دیکھ کے انہیں علم ہو جائے گا، ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور وہ ہمارے بیچ میں سے نکلے کوئی بہتر سمجھیں گی لیکن ہوا یہ کہ اب بھی میں ان کے نزدیک قابل اعتبار تھی۔ یہ ان کی مجھ سے محبت ہی تو تھی وہ مجھے صاعد سے اس لیے دور نہیں رکھنا چاہتی تھیں کہ انہیں مجھ سے ڈرہ تھا بلکہ اپنی طرف سے تو وہ مجھے خطروں سے بچانا چاہتی تھیں۔

ان کی بات نے مجھے آسمان سے زمین پر گر ڈالا تھا اور اب صاعد کا پیار سے اعتراف محبت مجھے زمین کے اندر دھنسا رہا تھا۔ صاعد کی بات پر پیار کی اڑتی رنگت نے مجھے احساس دلایا کہ یہ میری غلط فہمی تھی کہ پیار کے بارے میں کوئی خاص جذبات

نہیں رکھتیں۔ میں نے خود انہیں ٹوٹے بکھرے دیکھا جب صاعد نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔ مجھے اب یہ سوچنا پڑے گا کہ کیا میں عمر بھر تمہارا ساتھ برداشت کر سکوں گی یا نہیں۔ اس شخص کے ساتھ زندگی گزارنا آسان نہیں جو آپ کے سب سے پاکیزہ جذبے کو گالی دے۔“

ان کی اس بات پر پیاروں سفید پڑ گئی تھیں جیسے صاعد نے انہیں سزائے موت سنا دی ہو۔ یہ فیصلہ سناتے ہوئے میں نے صاعد کی آنکھوں کو بھی دیران ہوتے دیکھا اور تب مجھے پتا چلا کہ محبت یہاں نہیں وہاں تھی۔ تو پھر یہاں کیا تھا؟ یہ بھی اسی وقت پتا چل گیا..... صاعد ہی کی زبانی۔

”میں نے کبھی مینو کو تمہاری بہن کی حیثیت سے نہیں دیکھا“ میں نے اسے اپنی بہن، اپنی بیٹی کی حیثیت سے.....“

اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ میں پلٹی اور بھاگ کے اس کمرے سے نکل گئی۔ مجھے اپنے جیسے پیار کی آوازیں آتی رہیں مگر میں اوپر چلی گئی۔ راستے میں گیس کے کانپ بکھرے تھے جن سے میں ٹھوکر کھائے کرتے پرتی۔ میرا سر دیوار سے ٹکرایا تھا لیکن مجھے کوئی درد محسوس نہیں ہوا۔ اس وقت ہر احساس پر ایک ہی احساس حاوی تھا۔ شرمندگی کا..... ذلت کا..... افسوس کا!

میں خود کو جتنی بھی سخت سزا دوں وہ کم ہوگی۔ میں نے کوئی پھوٹا موٹا گناہ نہیں کیا۔ میں نے اتنی محبت کرنے والی پیار کو غلط سمجھا۔ ایک دوسری محبت کی خاطر ان کی اتنی پرانی محبت کو بھلا دیا اور وہ..... وہ میری خاطر صاعد کی محبت پر بھی شک کر بیٹھیں۔ میرے لیے انہوں نے اس شخص کی پروا نہ کی۔ جس سے دونوں بعد ان کی شادی ہونے

والی تھی۔

میں نے صاعد کو چاہنے کی حماقت بھی کی۔ اس سے بڑی بے وقوفی ان کی محبت کو غلط انداز میں لینے کی۔ اور پھر اس غلط محبت کو جتنے غلط طریقوں سے حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی کیا یہ سب معاف کرنے کے قابل ہے؟

ہرگز نہیں۔ جب میں خود اپنے آپ کو معاف نہیں کر پا رہی تو کوئی دوسرا کیا کرے گا؟ میں جانتی ہوں ابھی وہ دونوں کچھ نہیں جانتے لیکن جان تو جائیں گے تب میں کیا کروں گی؟ کیسے سامنا کروں گی ان دونوں کا؟

مجھے زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ یہی میری سزا ہے اور جواب شروع ہو چکی ہے۔ اس سے زیادہ لکھنے کی اب مجھ میں سکت نہیں ہے۔ سانس لینا..... مشکل..... ہو رہا ہے۔
کمرے میں..... گیس بھرتی جا رہی ہے۔



شکستہ تحریر میں لکھی ان آخری سطروں کے بعد ساری ڈائری خالی ہے۔ اس سفید چھت، گلابی دیواروں والے خالی کمرے میں رہی رائٹنگ ٹیبل کی منتقل دراز میں اس رات سے بڑی گلابی مٹلیں جلد والی یہ ڈائری ہو سب کچھ لکھ لئی سب کچھ اور ان ”سب کچھ“ کا قاری بھی ہوں سامع بھی میں ہوں میں یعنی اس کا خالی کمرہ۔
اور وہ یہ یہاں بیٹھ ہیں اب تک اس راز سے انجان ہیں۔

یہ کمرہ جس میں رہنے والی اس بے حد جذباتی سی اور کچی کچی سوچ رکھنے والی کم عمر لڑکی نے ان دونوں کو الگ کرنے کی کبھی کوشش کی تھی۔ وہ نہ رہی۔ لیکن شاید اس کی کوشش کے رنگ باقی تھے کہ ایک ہو جانے کے بعد بھی وہ ایک نہ ہو سکے اور آج اسی رن کی یادیں ان دونوں کو تریب لے آئی تھیں۔

”میں اس سے بہت پیار کرتی تھی صاعد! بہت زیادہ“ نازنین نے بیگی آ نکھیں صاعد کے ہاتھ کی پٹ پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”مگر وہ میری وجہ سے..... یقین

کرؤ میں دانستہ اسے دکھ دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی اس کے باوجود پتا نہیں کیسے میں اسے اتنا دکھی کرتی رہی کہ.....

”بس ناز و بس..... وہ بھی جانتی تھی کہ تم اسے کتنا چاہتی ہو“ صاعدا نے اس کے سر پر ہاتھ بھیرا۔

”اس نے جانے میں جلدی کی بہت جلدی“ ابھی تو اسے بہت کچھ دیکھنا تھا تاں صاعدا.....!“

”ہاں بہت کچھ۔ اسے ہمیں ایک دوسرے کے قریب دیکھنا تھا۔“ وہ مسکرایا۔
 ”اور وہ بہت خوش ہوتی یہ جان کر کہ اسے بے حد بے حساب چاہنے والی وہ بتیاں ایک دوسرے کو بھی اتنا ہی چاہتی ہیں۔ تم دکھی مت ہو تا زو نہ ہی خود کو الزام دو وہ تمہاری وجہ سے نہیں بلکہ.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ ناز و مینو کی بہن تھی۔ وہ پوری دیانت داری سے بغیر جھجکے خود کو مینو کی بے وقت موت کے لیے مورد الزام ٹھہرا رہی تھی لیکن صاعدا ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے اندر کی غلطی اس نے بے چین کیے ہوئے تھی لیکن وہ ناز و مینو کو یہ کہتے ڈرتا تھا کہ مینو کی موت کا کہیں نہ کہیں وہ بھی ذمے دار ہے۔
 یہ عدالت میں نے لگائی تھی۔

ناز و مینو محمود اور صاعدا کو میں نے کٹھن سے طلب کیا تھا دونوں نے اپنے اپنے بیان پوری سچائی کے ساتھ وہاں لگائے تھے۔

ایک وہ تھی جس کے خیال میں اس کی بے وجہ روک ٹوک اور بے بنیاد تنگ نے اس کی بہن کو اس حد تک دل برداشتہ کر دیا کہ وہ موت کو گلے لگا بیٹھی۔

ایک وہ تھا جس کے خیال میں ناز و کو تنگ کا موقع اس کے غلط طریقے نے فراہم کیا تھا جس کے باعث وہ معصوم موت کی آغوش میں چلی گئی۔

اس کا ذمہ دار ہمارا معاشرہ ہے یا ہمارا میڈیا ہے جس نے اپنی چکا چوند سے نو عمر بچوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ انہیں عام زندگی میں بھی وہی رنگ و بو چاہیے جو وہ دیکھتے ہیں۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے وہ اس کے سر میں گرفتار ہیں..... انہیں جو محبت بھری داستانیں دکھائی جاتی ہیں اس کے مرکزی کردار ایلی مینو شریں فرہاد یا پھر سنی مہینوال ہوتے ہیں اور انہیں از بر کرایا جاتا ہے کہ محبت و جنگ میں سب کچھ جائزہ ہے۔ کیا یہ سب ٹھیک ہے..... بتائیے کون ہے قصور وار؟ کس کے کھاتے میں ڈالا جائے یہ جرم؟

اختتام